سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری سنہ ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے، جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف سنہ ۸۲ء سے لے کر سنہ ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔

"منیجر"

جلد ۱۴۷ ماہ شوال المکرم سنہ ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۹۱ء عدد ۵

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی ۳۲۲-۳۲۴

مقالات

تاج الدین محمود داشہی، چھٹی ساتویں صدی ہجری کے عارف، شاعر و ادیب — پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ ۳۲۵-۳۴۳

برصغیر میں قرآن حکیم کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ — ڈاکٹر وفا راشدی، کراچی، پاکستان ۳۴۴-۳۵۱

خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے — جناب محمد بدیع الزماں صاحب، ریٹائرڈ اڈیشنل مجسٹریٹ، پھلواری شریف پٹنہ ۳۵۲-۳۵۸

مصر کے مشہور ادیب و صحافی احمد حسن الزیات — جناب ابوسفیان اصلاحی، شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۳۵۹-۳۷۸

احوال قادر ولی عرف شاہ میراں کا تحقیقی جائزہ — جناب شاکرہ صاحبہ، وجیا نگر کالونی حیدرآباد ۳۷۹-۳۸۳

سرسید اکادمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سمینار "علی گڑھ تحریک پس منظر اور پیش منظر" — ضیاء الدین اصلاحی ۳۸۴-۳۸۵

اخبار علمیہ — ع۔ص ۳۸۶-۳۸۹

مکتوب پاکستان — جناب شیخ نذیر حسین صاحب، مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۳۹۰-۳۹۲

وفیات

مولانا عبدالملک جامعی مدنی — مولانا افتخار فریدی، مرادآباد ۳۹۳-۳۹۴

مطبوعات جدیدہ — "ض و ع۔ص" ۳۹۵-۴۰۰

شذرات

گذشتہ عام انتخابات کو ابھی ڈیڑھ برس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس مہینہ میں پھر نیا انتخاب ہونے والا ہے، لیکن اس میں بھی کسی ایک ہی پارٹی کو واضح اکثریت ملنے کے امکانات نظر نہیں آتے، کانگریس سب سے بڑی اور قدیم پارٹی ہے، اس کی کامیابی سے ملک کو پانچ برس کے لیے انتخابات سے نجات مل سکتی ہے، لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی موہوم اور پُر فریب وعدوں سے رائے عامہ کو ہموار کرنا چاہتی ہے، دراصل اس نے اپنی پچھلی ناکامی سے کوئی سبق نہیں لیا اس لیے اس سے لوگوں کی بیزاری اور نفرت قائم ہے، بھارتیہ جنتا پارٹی ایک منظم جماعت ہے، لیکن وہ کوئی ملک گیر پارٹی نہیں، اور اب ہر شخص یہ سمجھنے لگا ہے کہ وہ صرف اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے ذات پات، فرقہ واریت اور مذہبی جنون کو ہوا دے رہی ہے، جس کا نتیجہ خون خرابہ، تشدد اور انتشار ہے، جنتا دل کا شیرازہ بکھر چکا ہے، اس کے ووٹوں کی تقسیم سے کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو فائدہ پہونچے گا، بالفرض اس کو واضح اکثریت مل بھی گئی تو اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ اس میں پھر تقسیم نہ ہو، کیونکہ اس کی حکومت گر جانے میں بھارتیہ جنتا کی حمایت واپس لینے سے زیادہ خود اس کی باہمی کشمکش اور رسہ کشی کو دخل تھا۔

ایسے غیر یقینی حالات میں انتخاب کے بعد بھی نہ سیاسی استحکام پیدا ہوگا اور نہ عوام کو راحت ملے گی، بلکہ ان کی پریشانیوں اور دشواریوں میں اضافہ ہوگا، رشوت، چور بازاری، مہنگائی اور بدعنوانی بڑھے گی، ملک میں فوضویت اور انتشار پیدا ہوگا، تشدد، خوں ریزی اور قتل و غارتگری کا دور دورہ ہوگا، شر و فساد پر آمادہ فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملیگا، قوم و ملک کی تعمیر و ترقی کے راستے مسدود ہو جائیں گے، آزاد، خوشحال اور پُر امن ہندوستان کا منصوبہ خاک میں مل جائے گا، دراصل خدا بیزار، کردار سے محروم اور اصول پسندی سے عاری سیاست کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔

ملک میں نہایت تیزی سے جو ذہنی پستی اور اخلاقی انحطاط آیا ہے، اس کا اثر سب سے زیادہ سیاست پر پڑا ہے، موقع پرست، مفاد پسند اور خود غرض سیاست دانوں نے پورے ملک کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے، ان کی دخل اندازی سے ہر شعبۂ زندگی میں بے اصولی، بدعنوانی اور خلفشار مچا ہوا ہے، سیاست کا نہ کوئی معیار ہے اور نہ ضابطۂ اخلاق، جیسے تیسے اقتدار پر قبضہ کرنا ہی مقصد رہ گیا ہے، کوئی پارٹی دودھ کی دھلی ہوئی نہیں ہے، سب کی نظر صرف ووٹوں پر ہے، جن کو حاصل کرنے کے لیے غلط اور خطرناک قدم اٹھانے اور ملک و قوم کے مفاد سے سمجھوتہ کر لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی، قوم کے بنیادی مسائل اور ملک کی اہم ضرورتوں سے کوئی سروکار نہیں، ہر پارٹی ایسے لوگوں کو ٹکٹ دیتی ہے جو لوٹ کھسوٹ، زور زبردستی اور غنڈہ گردی سے بوتھوں پر قبضہ کر لیں، خوف و ہراس، شورش اور دہشت زدگی کے اس ماحول میں نیک طبع، شریف اور امن و صلاح پسند لوگوں کی جان پر بن آئی ہے، اور انھوں نے سماج دشمن اور جرائم پیشہ لوگوں کے خوف سے چُپ سادھ لی ہے۔

گو ان حالات میں بظاہر دم سادھ لینے ہی میں عافیت ہے، لیکن اس سے آنے والا طوفان رک نہیں سکتا، بلکہ شر پسندوں اور غلط کاروں کے حوصلے بلند ہوں گے اور انھیں اپنی من مانی کرنے کا مزید موقع ملے گا، اور رفتہ رفتہ حالات اس قدر بدتر ہو جائیں گے کہ اصلاح کی ساری امیدیں ختم ہو جائیں گی، غنیمت ہے کہ ملک کی اکثریت اب بھی سیکولر اور جمہوریت پسند ہے اس کا ضمیر مردہ نہیں ہوا ہے، عام لوگوں کی طبیعت میں شرافت اور بھلمنساہت ہے، ان کو میل ملاپ، اخوت، بھائی چارگی اور امن و امان پسند ہے، لیکن وہ شور و غوغا میں الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں، جو مناسب نہیں، جمہوریت میں انتخابات کی بڑی اہمیت ہے، یہ ملک کے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگوں کے ہوش و تدبر کے امتحان کا وقت ہے، یہ انتخاب نفرت و تشدد بھڑکانے والے، کمزور فرقوں، پس ماندہ طبقوں اور لسانی و مذہبی اقلیتوں کی ترقی میں

رکاوٹ بننے والے افراد اور جماعتوں کے علاوہ ان لوگوں سے بھی چھٹکارا پانے کا وسیلہ ہے جنکے سایے میں فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر پھولتے اور پھلتے رہے ہیں، ملک و وطن سے محبت و خیرخواہی کا یہی تقاضا ہے، اس معاملہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری دُہری ہے، کیونکہ حق و عدل کا قیام اور شر و فساد کا انسداد ان کا مذہبی و ملی فریضہ ہے۔

گزشتہ ماہ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور جناب میکش اکبرآبادی رحلت فرماگئے، قاضی صاحب میرٹھ کے ایک علمی و دینی خاندان کے فرد اور دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلا میں تھے، وہ عرصہ تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ دینیات و تاریخ اسلام کے صدر رہے، تحریر و تصنیف کا ذوق مولانا تاجور نجیب آبادی کی صحبت میں پیدا ہوا، ابتدا میں مصطفےٰ منفلوطی کے عربی افسانوں کا اردو ترجمہ کیا، کئی برس تک میرٹھ سے "الحرم" نکالتے رہے، جس کے کئی خاص نمبر شایع ہوئے اردو عربی لغت میں بیان اللسان اور قاموس القرآن ترتیب دی، ندوۃ المصنفین دہلی کی کتاب "تاریخ ملت" کے بعض حصے مرتب کیے، دو تین برس قبل ان کی کتاب "شہید کربلا" شایع ہوئی، جمعیۃ علمائے ہند اور دارالعلوم دیوبند کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے، کئی برس سے بیمار تھے، ۱۹۸۳ء میں آخری بار دہلی کے مدنی سیمینار میں ملاقات ہوئی تو بہت کمزور ہوگئے تھے، طبیعت میں نفاست تھی، خوش وضع، خوش پوش اور خلیق و ملنسار شخص تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، میکش اکبرآبادی اردو کے پختہ مشق شاعر اور اچھے اہل قلم تھے، انھوں نے درس نظامی کی تکمیل مدرسہ عالیہ آگرہ میں کی، نظم و نثر میں متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، ادبی رسالوں میں ان کی نگارشات برابر شائع ہوتی تھیں، اقبال و غالب بھی ان کی دلچسپی کے موضوعات تھے، ان کا میلان تصوف کی طرف تھا، جس کا اثر ان کی نظم و نثر دونوں پر تھا، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

مقالات

تاج الدین محمود اشنہی

چھٹی ساتویں صدی ہجری کے عارف، شاعر و ادیب

پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ

["زیر نظر مقالے کا خاکہ عرصہ ہوا تیار ہوگیا تھا، مگر اسکے مکمل کرنیکا موقع اب ملا، اس مقالے کی شان نزول بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، راقم السطور کو عرصے سے عوارف المعارف تالیف شیخ شہاب الدین سہروردی کے فارسی ترجموں سے دلچسپی رہی ہے ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ سخاوت مرزا صاحب نے مجلہ فکر و نظر میں اشاعت کے لیے ایک مختصر سا مقالہ عوارف المعارف کے قدیم فارسی ترجمے کے عنوان سے بھیجا، اس میں کتابخانہ آصفیہ کے ایک نسخہ کا ذکر تھا، مترجم قاسم داود خطیب جیر (کذا) نے شیخ بہاءالدین زکریا کے معاصر سلطان ابوبکر بادشاہ "ایران توران" کے لیے عوارف المعارف کا ترجمہ کیا۔ مرزا صاحب کے نزدیک سلطان ابوبکر سے مراد ابوبکر بن سعد بن زنگی اتابک سلجوقی (۶۲۳-۶۵۸) ہے اور "جیر" سے قصبہ جیر نداب مراد ہوگا۔ یہ مضمون

لہ یہ محققانہ مقالہ کئی ماہ پہلے موصول ہوا تھا لیکن اشاعت کے لیے اب گنجایش نکل سکی ہے (ض)

مجلہ "فکر و نظر" جولائی ۱۹۶۳ء میں چھپا، مجلے کے اسی شمارے میں راقم نے اس کا
تکملہ شایع کیا، اس میں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سلطان ابوبکر جس کا لقب تاج الدین
تھا، عزالدین کبیر خانی کا بیٹا تھا، عزالدین مذکور منکبرنی کہلاتا ہے، وہ سلطان
التمش کا رومی غلام تھا جس نے سلطان رضیہ کے زمانے میں ۶۳۶ھ میں سندھ میں
اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور اچہ اور ملتان پر بھی قبضہ کر لیا، لیکن جلد ہی ۶۳۹ھ
میں اس کا انتقال ہو گیا، اس کی وفات پر اس کا بیٹا تاج الدین ایاز جانشین ہوتا
ہے اور سندھ، ملتان اور اچہ پر اپنا قبضہ بحال رکھتا ہے، لیکن ۶۴۳ھ کے قریب
وہ بھی فوت ہو جاتا ہے، اس کے بعد یہ علاقے دلی حکومت میں شامل ہوتے ہیں،
قاسم داود خطیب مترجم عوارف خطیب اچہ تھے، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے
اشارے پر وہ ترجمہ کرتے ہیں اور اس کو نوجوان فرمانروا تاج الدین ابوبکر جس کے
القاب تقریباً ایک صفحے میں آئے ہیں۔ اس کے نام معنون کرتے ہیں، اس طرح یہ
ترجمہ ۶۳۹ھ کے بعد ہوا اور سب سے قدیم ترجمہ قرار پایا۔ سلطان تاج الدین
ابوبکر کی مدح میں عمید لوئکی کے دو قصیدے ملتے ہیں، عمید نے بھی اس کی ایک
آزاد فرمانروا کی حیثیت سے مدح سرائی کی ہے، چند سال بعد راقم السطور کو قاسم
داؤد کے ترجمے کے ایک دوسرے نسخے کا آگرے میں پتا چلا جو ۷۵۸ھ کا مکتوبہ تھا
چنانچہ اس مخطوطے کے تعلق سے ۱۹۷۲ء میں ایک مقالہ انڈو ایرانیکا (کلکتہ) میں
شایع کیا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ظہیر الدین عبدالرحمٰن (وفات ۷۱۶) کے ترجمہ
تک رسائی ہوئی، ساتھ ہی انکے پوتے صدرالدین جنید (وفات ۷۹۱) کا خلاصہ[1]

۱؎ اس کا دیوان راقم کی توجہ سے مجلس ترقی ادب لاہور سے شایع ہو چکا ہے۔

ان دونوں پر ایک مقالہ انڈو ایرانیکا میں شایع کیا، اسکے بعد شیخ اسماعیل بن عبدالمومن
کے ترجمۂ عوارف کا ایک نسخہ جو برٹش میوزیم میں تھا، ملا، یہ ترجمہ ۶۶۵ھ کا تھا
اور نسخہ ۶۹۷ھ کا مکتوبہ تھا۔ راقم السطور نے اس پر ایک مقالہ بنیاد فرہنگ
تہران کے زیر اہتمام ایک جلسے میں سری نگر کشمیر میں پڑھا، یہی مقالہ بعد میں مجلۂ بیاض میں
شایع ہوا۔ اسماعیل بن عبدالمومن شیخ المشایخ زین الدین کاموی کے مرید تھے
کاموی کے حالات اس وقت نہیں ملے تھے، کچھ دنوں بعد جمالی اردستانی (وفات
۸۷۹) کی تحریروں میں کاموی کا تذکرہ نظر سے گذرا، اسی درمیان جمالی پر معارف
۱۹۸۲ء میں ایک مقالہ لکھا جس میں کاموی کے بارے میں بھی عوارف المعارف
کے مترجم کی نسبت سے کچھ ضروری باتیں درج کیں، اسماعیل بن عبدالمومن اصفہانی
نے اپنے ترجمے میں تاج الدین محمود اشنہی اور ان کے بیٹے صدرالدین محمد اشنہی
کے اشعار درج کیے، راقم نے اپنے مقالے میں ان دونوں بزرگوں کو متعارف
کرتے ہوئے ان کے اشعار اکٹھا کر دیے تھے، اسی زمانے میں کتابخانہ مجلس تہران
(فہرست ج ۳ شمارہ ۹۰۵) میں ایک سفینہ اشعار کا تعارف نظر سے گذرا، اس
قدیم سفینے میں ص ۳۰۷ ببعد تاج الدین اشنہی کا کافی کلام درج ہے، اس میں
موصوف کو ملک الحکما والواعظین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ان اشعار کے
حصول کی ساری کوشش ناکام رہی، بہرحال سفینہ کے اشعار کا حوالہ میرے
مقالے ص ۱۳۱ کے حاشیے میں درج ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ سال گذشتہ
نجیب مائل ہروی نے مجموعۂ آثار تاج الدین اشنہی کے نام سے ایک رسالہ
تہران سے شایع کیا ہے جو تحقیق تدوین متن کا قابل تقلید نمونہ ہے۔ میری خوشی کی

کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس میں سفینۂ کتابخانۂ مجلس سے اشنہی کے اشعار لیے گئے ہیں، لیکن باوجود اس کے کہ اسماعیل بن عبدالمومن کے ترجمے پر میرا مضمون فارسی میں تھا، اس کا ذکر نہ اس ترجمے کے شایع شدہ نسخے میں ہے اور نہ نجیب مائل ہروی کے محققانہ مقدمے و تعلیقات میں، البتہ قاسم داؤد خطیب اجہ کے ترجمے پر میرا جو انگریزی میں مضمون ہے اس کا ذکر مصحح ترجمہ اسماعیل بن عبدالمومن اصفہانی اور نجیب مائل ہروی دونوں کے یہاں موجود ہے۔

میرے مضمون کے بعد اس سے تعلق رکھنے والی تین کتابیں ایران سے شایع ہوئیں:

(۱) ترجمہ عوارف المعارف از اسماعیل بن عبدالمومن ابی منصور ماشادہ، بہ تصحیح قاسم انصاری، شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، تہران ۱۳۶۴، لیکن کتاب کے سرورق پر مترجم کا نام صرف ابو المنصور عبدالمومن لکھا ہے، اس کے مقدمے وغیرہ میں میرے مقالے کا کہیں ذکر نہیں، البتہ قاسم داؤد پر جو مقالہ ہے اس کا ذکر موجود ہے

(۲) پنج گنج، اس کے مقدمے میں ہمایوں فرخ نے جمالی اردستانی کے منقولات جو شیخ زین الدین کاموی سے متعلق ہیں، جمع کر لیے ہیں، یہ مقدمہ میری نظر سے نہیں گذرا، مجھے معلوم نہیں کہ زین الدین کاموی کے بارے میں جمالی اردستانی کے مندرجات جن کی طرف میرے مقالہ معارف ۱۹۸۲ء میں اشارہ ہے، ان کا ذکر اس مقدمے میں ہے یا نہیں۔

(۳) مجموعۂ آثار فارسی تاج الدین اشنہی، مقدمہ، تصحیح و تعلیق از نجیب مائل ہروی، کتاب خانہ طہوری، تہران ۱۳۶۸، یہ رسالہ ادبی تحقیق کا قابل تقلید نمونہ ہے، اس میں مصحح نے تاج الدین اشنہی کے تعلق سے جو بھی مواد کہیں بھی ملا، اس سے پوری طرح استفادہ کر لیا، اس میں تاج الدین کی تین تصانیف کا انتقادی متن ہے جو انتہائی محققانہ انداز میں تیار ہوا ہے۔ میں نے زیر نظر مضمون میں اسی کتاب سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے،

اگرچہ تاج الدین اشنہی کے بارے میں ادھر کافی مواد جمع ہوا ہے لیکن راقم نے آج سے بہت پہلے اس پر یادداشت لکھی تھی، اس لحاظ سے اس معاملے میں اولیت کا شرف میرے مقالے کو حاصل ہے۔]

تاج الدین اشنہی ساتویں صدی کے نامور عارف اور شاعر تھے، ان کا تعلق اشنہ سے تھا جو آذربائیجان میں ارومیہ (رضائیہ) سے دو روز راہ پر واقع ہے، یہ قصبہ اشنو، اشنویہ بھی کہلاتا ہے، تاج الدین اشنہی، اشنوی، اشنوئی اور شنوی نسبت سے یاد کیے گئے ہیں اور ان کو شیخ شیوخ الاسلام، سلطان المحققین، ملک الحکما والواعظین اور سلطان المتکلمین وغیرہ کہا گیا ہے، ان کا نام محمود، کنیت ابو محمد، تاج الدین لقب معلوم ہوتا ہے، تحفۃ اہل الوصول میں[۱] یہ نام اس طرح آیا ہے۔

شیخ الاسلام حجۃ اللہ علی الخاص والعام سلطان سلاطین المحققین

---

[۱] ترجمہ عوارف، مقدمہ بقلم قاسم انصاری ص ۲۸، ۲۹، مجموعۂ اشعار فارسی، ترتیب نجیب مائل ہروی، مقدمہ ص ۱۵۔

ابو محمد محمود بن خداداد بن ابی بکر بن یوسف اشنہی ۔

اشنوی کے ماخذ میں ان کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، البتہ ان میں کچھ اشارے مل جاتے ہیں، اس طرح کے ماخذ حسب ذیل ہیں:

۱۔ غایۃ الامکان فی درایت الزمان از خود اشنہی ۲۔ تحفۃ العرفان فی ذکر سید الاقطاب روزبہان از شیخ شرف الدین بن صدر الدین روزبہان ثانی ۳۔ روح الجنان از شیخ شمس الدین عبد اللطیف بن صدر الدین روزبہان ثانی ۴۔ شد الازار از شیخ جنید شیرازی ۵۔ مجمل فصیحی در حوادث ۶۴۶ ۔ ۶۔ تاریخ گزیدہ احمد اللہ مستوفی، ۷۔ تحفہ اہل الوصول فی علم الفصول از اسماعیل بن عبد المومن مترجم عوارف ۸۔ تاریخ وصاف حضرت ۹ ۔ ہزار مزار ترجمہ شد الازار از عیسیٰ بن جنید۔

تاج الدین اگرچہ اشنہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ ہرات میں گذرا مجمل فصیحی وقائع ۶۴۶ کے ذیل میں ہے کہ سیف الدین باخرزی (م: ۶۵۹) نے خرقۂ تبرک اشنوی کے ہاتھ سے ہرات میں پہنا اور امام الدین داود بن محمد بن روزبہان الفرید (م: ۶۷۱) کو ہرات ہی میں اشنوی سے تلقین ذکر و اجازہ ملی۔ اصیل الدین واعظ اور جامیؒ نے لکھا ہے کہ ہرات میں مجد الدین طالبہ کے مدفن کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تاج الدین اشنوی کے زمانے کا قطعی تعین بھی دشوار ہے، اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شہرت ایک عارف کی حیثیت سے ۶۰۰ھ تک ہو گئی ہوگی، اس لیے کہ روزبہان بقلی (م ۶۰۶) کی زندگی میں وہ مشہور ہو چکے تھے اور ۶۴۶ میں

سیف الدین باخرزی ہرات میں ان کے مرید ہو چکے تھے، تاج الدین کے بیٹے صدر الدین محمد اشنوی ۶۲۳ھ کے قریب جلاوطن کر دیے گئے تھے ان امور سے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ شیخ تاج الدین ۵۵۰ھ کے قریب پیدا ہوئے[1] ہوں گے۔

تاج الدین کے والد کا نام تحفہ اہل الوصول[2] میں خداداد ملتا ہے، اسی کتاب کے حوالے سے یہی نام مقدمہ ترجمۂ عوارف (ص ۲۸ میں) اور مقدمہ روزبہان نامہ (ص ۵۱) میں درج ہے۔ لیکن مجمل فصیحی کے مطبوعہ نسخہ[3] میں ذیل واقعات ۶۴۶ تاج الدین کے باپ کا نام حداد ملتا ہے اور یہی نام علامہ قزوینی کے یہاں بھی ہے۔

تاج الدین کے شیخ شمس الدین محمد بن عبد الملک دیلمی تھے، مگر انکے بھی حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہے، ان کی متعدد تصنیفات میں ایک کشف الحقائق ہے جو ۵۸۹ھ میں تالیف ہوئی، اس بنا پر ان کی تاریخ وفات ۵۹۰ اور ۶۰۰ کے بیچ[4] قرار دی گئی ہے، اسماعیل پاشا[5] نے ان کی وفات ۳، ۵ ہجری میں بتائی ہے جو صحیح نہیں، سید نوربخش قہستانی[6] (۷۹۵۔ ۸۶۹) کے نزدیک وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، نجیب مائل ہروی نے ۴۲ کتابوں اور رسالوں کے نام مجموعۂ

[1] مجموعہ آثار فارسی ص ۸۔ ۹ [2] ترجمۂ عوارف، تصحیح قاسم انصاری مقدمہ ص ۲۸ [3] ج ۲ ص ۲۱۶: شیخ سیف الدین خرقۂ تبرک از دست شیخ تاج الدین محمود بن الاشنہی پوشیدہ در ہرات [4] دیکھیے مجموعۂ آثار فارسی ص ۴ [5] اسماعیل پاشا کی کتاب "المکان" ۴، دیکھیے مجموعۂ آثار فارسی (ایضاً)، [6] سلسلۃ الاولیاء ص ۳۲۔

آثار فارسی (ص ۴-۶) گنائے ہیں، آقائے دانش پژوہ[1] کے یہاں بھی بعض کتابوں کے نام ملتے ہیں۔

تاج الدین اشنہی کے مریدین میں تین اشخاص کا نام ملتا ہے۔

۱۔ شیخ سیف الدین باخرزی، مجمل فصیحی ج ۱ ص ۳۱۶ ذیل حوادث ۶۴۶[2] میں آیا ہے: "شیخ سیف الدین باخرزی خرقۂ تبرک از دست شیخ تاج الدین محمود الاشنہی پوشیدہ۔"

مجمل میں تو یہی ہے کہ شیخ سیف الدین نے تاج الدین اشنہی سے ۶۴۶ھ سے بہت قبل خرقۂ تبرک پایا لیکن دانش پژوہ نے روزبہان نامہ (ص ۵۱) میں یہ جملہ لکھا ہے: "این اشنہی اسناد خرقۂ تبرک از سیف الدین باخرزی (۵۷۶-۶۵۹) دارد"

بظاہر یہ قول مبنی ہے مجمل فصیحی کے بیان پر جہاں واضح طور پر ہے کہ باخرزی نے اشنہی سے خرقہ پایا نہ کہ اشنہی نے باخرزی سے۔

ابو المعالی سیف الدین باخرزی چھٹی اور ساتویں صدی کے مشایخ میں تھے، فصیحی کے قول کے مطابق مدت تک ہرات میں مقیم رہے اور فقہ، لغت اور تفسیر کا درس لیا اور اشنہی کے ہاتھ پر بیعت کی[3]، ۶۴۶ میں بخارا میں وفات پائی، انکی متعدد تصانیف ہیں جس میں حسب ذیل[4] قابل ذکر ہیں۔

---

[1] مقدمۂ روزبہان نامہ [2] دراصل اس سال یعنی ۶۴۶ میں شیخ باخرزی کی وفات ہے۔ انکی وفات کی دوسری تاریخ ۶۵۹ بھی مجمل میں ہے [3] فقہ و لغت و تفسیر کی تعلیم ہرات اور نیشاپور میں حاصل کی اور حدیث تلامذہ اساتذہ شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲) تھے انکے تین بیٹے تھے، جلال الدین محمد جو باپ سے پہلے بخارا میں فوت ہو چکے تھے، برہان الدین احمد حج سے واپسی پر کرمان میں مقیم ہو گئے، تیسرے مظہر الدین مطہر (مجمل فصیحی) [4] مجموعۂ آثار فارسی ص ۸-۹۔

شرح اسماء الحسنیٰ: نسخہ کتاب خانہ شیرانی، لاہور

وقائع الخلوۃ: نسخہ در فرہنگستان لائڈن

رسالہ وصیۃ السفر: اس کا فارسی خلاصہ ابو المفاخر یحییٰ نے تیار کیا تھا۔

رسالہ در عشق: تہران میں تین بار چھپ چکا ہے۔

منظومات: دو رسالہ عرفانی در عشق

رباعیات: اس کا نادر نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے، اس کی رو سے مجلہ دانشکدہ ادبیات تہران میں شایع ہو چکا ہے۔

(۲) خواجہ امام الدین داود پسر محمد پسر روزبہان ساتویں صدی کے مشایخ میں ہیں، انھوں نے طریقہ اسناد و دعوت شیخ نجم الدین ابی الجناب و شیخ تاج الدین اشنہی سے حاصل کیا، شد الازار کے ترجمہ ہزار مزار میں خواجہ داود کا لقب عز الدین لکھا ہے[1] اور یہ بھی لکھا ہے کہ عز الدین داود خرقہ از دست پدر خود پوشیدہ و پدر او از دست پدر خود پوشیدہ و پدر او از شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ۔

شد الازار[2] سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ داؤد نجم الدین کبری کے ارادتمند تھے لیکن ذکر و ارشاد کی تلقین اور دعوت کی اجازت تاج الدین اشنہی سے حاصل کی۔

۳۔ شیخ محمد گہرزنی، عبد الرحمن اسفراینی نے لکھا ہے کہ شیخ محمود اشنہی قدس اللہ روحہ العزیز کے بارے میں آیا ہے کہ اس کے مریدوں میں ایک شیخ محمد گہرزنی ولایت یازرکا رہنے والا تھا۔ جب اس کو اپنے وطن بھیج رہے تھے تو اس کو یہ وصیت کی تھی کہ جب وہ اپنے وطن پہنچے تو سوائے ذکر اور خلوت کسی اور کام میں مشغول

---

[1] ص ۲۴۴، ۳۰۵، ص ۳۵۲۔

نہ ہو۔ شیخ گہرزنی نے پوچھا اے شیخ کیا اس کی اجازت ہے کہ کسی مسلمان بھائی کو مدد
دے سکتا ہوں جس سے وہ آسودہ حال ہو جائے۔ جب یہ بات شیخ محمود اشنہی کو
پہنچی تو سر جھکا لیا، تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور کہا مجھے ایسے شخص کی حالت پر
تعجب ہے کہ افعی نے اپنا زہر اس کے جسم میں پیوست کر دیا اور وہ دوسرے
کے پاؤں میں سے کانٹا نکالنے میں لگا ہو۔"

تحفۂ اہل عرفان[1] | تاج الدین اشنہی کے بارے میں ایک روایت

(ص ۲۷-۲۸) میں شرف الدین ابراہیم[1] نے شیخ تاج الدین محمود
کی بابت ایک روایت خود شیخ کے صاحبزادے صدر الدین محمد اشنہی کے حوالے سے نقل
کی ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ صدر الدین پسر قدوۃ المحققین و سلطان المتکلمین تاج الملۃ والدین
محمود اشنہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ میرے والد شیخ الاسلام
تاج الدین محمود رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ میر سید الاقطاب شیخ روزبہان[2] روح اللہ
روحہ کے معتقد و مرید تھے اور آنے جانے والوں سے شیخ روزبہان کے حالات
معلوم کرتے رہتے اور جب کوئی مسافر شیراز کی طرف سے پہنچتا تو اکثر اس کو اپنی
خانقاہ میں ٹھہراتے اور طرح طرح سے اس کی خاطر تواضع کرتے، ایک روز شیخ

[1] شرف الدین ابراہیم پسر صدر الدین ابی محمد روزبہان ثانی [2] روزبہان بقلی (۵۲۲-۶۰۶)

ع یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسماعیل بن عبد المومن اصفہانی مترجم عوارف المعارف شیخ تاج الدین
اشنہی کا بڑا عقیدتمند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے شیخ کے ان جوابات کو جو سفر حج میں ان سے
کیے گئے تھے فارسی میں منتقل کیا، دیکھیے مجموعۂ مختار فارسی ص ۸۵۔

رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید ان کے پاس آیا، میرے باپ شیخ الاسلام نے اس کی تعظیم و تکریم
کی اور بہت عزت سے رکھا، چند روز اسی طرح گذرے، مسافر میرے والد شیخ الاسلام
کے حالات کا بغور مطالعہ کرتا رہا، آخر اس درویش کے دل میں خیال آیا کہ انھیں (شیخ الاسلام)
سے خرقۂ تبرک کی درخواست کرے، چنانچہ اپنی غرض شیخ تاج الدین سے بیان کی۔
شیخ نے فرمایا: ٹھہرو، درویش نے کہا جیسی آپ کی مرضی، جب کچھ رات ڈھلی شیخ
تاج الدین آئے اور درویش کو بلا کر خانقاہ کی چھت پر لے گئے، اس کا کان پکڑا اور
کہا کان لگاؤ، دیکھو کیا سنتے ہو، درویش نے کہا: میں نے خوب کان لگایا، ایک
آہ سنتا ہوں جو میرے شیخ شیخ روزبہان کی آہ کے مانند ہے، پھر شیخ نے میرے
کہا: غور سے سنو، پھر میں نے شیخ کی آواز سنی، میں نے کہا کہ اے شیخ یہ آہ میرے
شیخ کی آہ ہے، شیخ نے فرمایا: اے درویش! تمہارے شیخ ایسے ہیں کہ ان کی آواز
ایک ماہ راہ کی دوری سے سنائی پڑتی ہے، تو پھر (ایسے شیخ کے بجائے) مجھ سے
خرقۂ تبرک طلب کرتے ہو؟ اس عزیز نے شیخ روزبہان کی خدمت میں استغفار کیا۔"

شیخ صدر الدین محمد اشنہی رحمۃ اللہ علیہ شیخ روزبہان کے مزار پر اکثر آتے
اور فرماتے وہ عاشقوں کے بادشاہ ہیں، خلائق کی مراد ان کے روضے سے جلد ہی
پوری ہو جاتی ہے، اگر دوسرے مشائخ دامن دامن بخشتے ہیں تو شیخ روزبہان
خرمن خرمن، لٹاتے ہیں وہ اپنے وعظ میں شیخ روزبہان کے مقولے بہت نقل کرتے۔
روح الجنان میں مولف تحفۂ اہل عرفان کے بھائی عبد اللطیف[1] نے بھی

[1] شمس الدین عبد اللطیف فرزند صدر الدین ابی محمد روزبہان ثانی، عجیب بات ہے کہ ہر دو
کے یہاں بھی دونوں بھائی کے بیانات نقل ہیں ص ۶-۷۔

یہی باتیں صدر الدین اشنہی کی روایت سے نقل کی ہیں، البتہ تفصیلات میں کہیں کہیں کچھ تفاوت ہے اس کا بھی ترجمہ دیا جا رہا ہے:

شیخ الشیوخ تاج الملۃ والدین محمود اشنہی رحمۃ اللہ علیہ شیخ (روزبہان) سے بڑی ارادت و محبت رکھتے تھے، ایک روز ان کی خدمت میں شیخ کا مرید پہنچا اور جیسا کہ مشائخ کا طریقہ ہوتا ہے کہ مسافر کے حالات دریافت کرتے اور اس پر عنایت فرماتے۔ عوام میں (مشائخ کے بارے میں) جو گفتگو ہوتی ہے (اس کی وجہ سے) اس درویش نے گھر کی راحت پر سفر کی مشقت کو ترجیح دیا تھا، اس کو شیخ کی سیرت بہت پسند آئی، چند روز کے بعد رخصت کی درخواست کی، شیخ نے کہا صبح تک انتظار کرو، جب سورج کا سفید چتر آسمان کے افق پر نمودار ہوا تو درویش کو رباط کی چھت پر بلایا اور کہا: جھروکے کی طرف کان لگاؤ اور سنو: کیا آواز آرہی، درویش نے سنا، آہ کی آواز تھی، شیخ نے کہا: اے درویش بتاؤ کہ کس کی آواز ہے، درویش نے جواب دیا: ایسا لگتا ہے کہ یہ میرے مرشد کی آواز نہیں[1] ہے، اس نے دوبارہ کان لگایا اور کہا: اے شیخ یقین ہو گیا یہ آہ و فغاں شیخ روزبہان کی ہے، شیخ تاج الدین نے فرمایا: اے ضعیف الاعتقاد درویش! جس کا شیخ ایسا ہو کہ ہر صبح اس کی آواز باز کی طرح فضا میں پرواز کرے اور نالہ و فغاں کی آواز شیراز سے قصبہ اشنوہ میں صاحبدلوں کے کان تک پہنچا دے اس کے لیے یہ کیونکر مناسب ہو گا کہ وہ دوسرا مرشد تلاش اور خرقہ و لباس کی بات کرے، واپس جاؤ اور اپنے مرشد کے آستانے کو

---

[1] اگر نیست کے بجائے ہست ہوتا تو بیان زیادہ صاف ہو جاتا۔

غنیمت جانو، یہ حکایت شیخ کے خلف الصدق کی روایت کی ہوئی ہے"

شیخ تاج الدین اشنہی کے پسر شیخ اشنہی کے ایک بیٹے کا پتا چلتا ہے جن کا نام صدر الدین محمد اشنہی ہے۔ یہ بڑے فاضل اور دانشمند تھے، علوم اسلامی میں بڑا درک رکھتے تھے، تصوف و عرفان کے ساتھ فلسفہ کی طرف ان کا رجحان تھا، غرض اپنے عہد کے بڑے دانشمندوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کے حالات زیادہ معلوم نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ اپنے باپ تاج الدین کے بارے میں انھوں نے ایک روایت نقل کی ہے[1] جس سے ان کے باپ کے مراتب عرفان کا پتا چلتا ہے، اسی سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ صدر الدین محمد بھی صوفیانہ رجحان رکھتے تھے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے والد بلکہ مشہور بزرگ روزبہان بقلی[2] کے ارادتمند معتقد تھے وہ ان کے مزار پر حاضری دیتے اور کہتے کہ وہ عاشقوں کے بادشاہ ہیں، خلایق کی مراد ان کے روضے سے جلد حاصل ہوتی ہے، اگر عام مشائخ "دامن دامن" دیتے ہیں تو وہ "خرمن خرمن" بخشتے ہیں۔ اگر شیخ روزبہان کے آستانے کی خاک سونگھیں تو اس سے بوئے عشق آئے گی۔

تاریخ وصاف حضرت[3] سے معلوم ہوتا ہے کہ اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی (٦٢٣ - ٦٥٨) کے عہد میں صدر الدین اشنہی شیراز میں مقیم تھے، وہ دور تصوف و عرفان کا دور تھا، اتابک اہل عرفان و تصوف کا بڑا قائل تھا، وہ انھیں عالموں اور دانشمندوں پر ترجیح دیتا، اس نے متعدد فضلا کو جن کا میلان فلسفہ و کلام کی طرف تھا، اپنے قلمرو سے اخراج کا حکم صادر فرمایا، وصاف حضرت میں ہے:

---

[1] دیکھئے تحفۂ عرفان تالیف شرف الدین ابراہیم، اس روایت کا ترجمہ نقل ہو چکا ہے۔
[2] انکے حالات کے لیے دیکھئے ہزار مزار ترجمہ شد الازار ص ۲۸۹-۲۹۳ [3] ص ۱۵۸-۱۵۹۔

آتابک باران انعام و اصطناع
بر زہاد و عباد و صلحا و متصوفہ
فایض داشتی و جانب ایشان را
بر ائمہ و علما و افاضل مرجح داشتی
و چون بداعیۂ حسن اعتقاد خریدار
متاع زہد و تقشف بود متلبسان
و متزہدان خود را در زی زہادت
جلوہ گری می کردند و بہ ایادی
و انعامات او محظوظ می شدند و
ارباب بلاغت و اصحاب نفوس
ساذجہ را گفتی اولیاء خدای تعالیٰ
اند و نفوس ملکی دارند و شائبہ
شعبدہ و احتیال خالی و عاطل اند
و ہذا المحال از خداوندان ذکا و
فطنت و اہل نطق و فضیلت متنفر
بودی و ایشان را بجز بہ فضول
نسبت دادی، لاجرم چند افراد
از ائمہ نامدار و علمای بزرگوار
را بواسطۂ نسبت علم حکمت از

اتابک کی انعام و نعمت کی بارش
سے زاہد، عابد، صالح اور صوفی
فیضیاب ہوتے اور وہ ان کو ائمہ
و علما و فضلا پر ترجیح دیتا اور
چونکہ حسن اعتقاد کی بنا پر وہ زہد
و ریاضت کشی کی متاع کا خریدار
تھا تو مکار و زاہد نما حضرات زہد
کے لباس میں نظر آتے اور اسکے
انعام و اکرام سے بہرہ ور ہوتے
اور اہل بلاغت اور سیدھے
سادے حضرات کو کہتا کہ یہ
لوگ اولیا اللہ اور فرشتہ صفت
ہیں اور شعبدہ گری اور مکاری
سے دور، اس کے برعکس صاحبان
علم و دانش و اہل نطق و فضیلت
سے خائف رہتا اور ان کو مکار
اور بیکار قرار دیتا، اس کا
نتیجہ ہوا کہ بڑے بڑے ائمہ اور
عظیم دانشوروں کو اس بنا پر

عاج کردہ قہراً و جبراً از شیراز
اخراج، از آنجملہ امام صدرالدین
محمود الاشنہی الواعظ بود کہ استحضار
و استبصار او در انتہا بکلی علوم
عقلی و نقلی چون بیاض نہار از
اقامت بینت استغنا داشت و
در شیوہ وعظ خود را ابن القری
عہد بل فریع الدہر می انگاشت
جماعت فضلا کہ در مجلس تذکیر
او حاضر شدہ اند تقریر کردہ اند
کہ کلیات و جزئیات علوم را
تا حدی مستحضر بود کہ اگر سائلی
از عویصات و مشکلات قسمی از
اقسام علوم اصول و فروع و الہیات
و طبیعیات و ہندسہ و ہیئت
و حساب و طب و تفسیر و وجوہ
قرأت و احادیث و ادبیات
سوال کردی علی الارتجال
جواب مسئلہ را بر وجہی ایراد

کہ وہ علم حکمت سے سروکار رکھتے
ان کو نکال دیا اور قہراً و جبراً
شیراز سے اخراج کا حکم دیا، ان
میں سے امام صدرالدین تھے جن
کا علم و نظر علوم عقلی و نقلی
میں صبح کی سفیدی کی طرح دلیل سے
بے نیاز تھی اور جو وعظ گوئی میں زمانے
کے ابن القری بلکہ انتخاب روزگار
تھے، جو فضلا ان کی مجلس وعظ میں
حاضر ہوتے ان کا قول ہے کہ علوم
کے کلیات و جزئیات ان میں اس
حد تک مستحضر ہیں کہ اگر کوئی سائل
اقسام علوم: اصول و فروع، الہیات
و طبیعیات ہندسہ، ہیئت، حساب،
طب، تفسیر، وجوہ قرأت، احادیث
ادبیات، میں سے کسی علم کے مشکل
سے مشکل مسئلے کے بارہ میں سوال کرے
تو وہ اس سوال کا جواب اس
انداز سے دیتا کہ اہل علم و فضل

نمودی کہ موجب وحشت اولی
الالباب گشتی، سالی در میان حاج[ع]
بموضعی عرفات وعظ می گفت و شیخ
حقانی شہاب الدین عمر السہروردی
در زمان آخر عمر بود و چشم ظاہر
پوشیدہ شدہ او را بہ محفہ نشاندہ
بمجلس او حاضر آوردند، سخنان او
را نیک پسندیدہ فرمود و تحسینہا
فرمود واین دو بیتی او در این حسب
حال خود و اتابک،
از صحبت تو کنون فراق اولی تر
بر درگہ تو زرق ونفاق اولی تر
چون پردۂ راستی مخالف کردی
مارا پس ازین راہ عراق اولی تر"

دنگ رہ جاتے، ایک سال
عرفات کے میدان میں حاجیوں کے
درمیان وعظ کہہ رہے تھے، شیخ
حقانی شہاب الدین عمر سہروردی
کا آخری زمانہ تھا اور ان کی بینائی
جاتی رہی تھی، ان کو پالکی میں بٹھا کر
صدر الدین اشنہی کی مجلس میں لے
گئے، انھوں نے اشنہی کی گفتگو بہت
پسند کی اور بڑی تعریف فرمائی
(اشنہی نے) یہ رباعی حسب حال کہی
ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔
یعنی تیرے پاس رہنے سے تو تجھ سے
الگ ہو جانا ہی بہتر ہے، تیرے
دربار میں مکر و فریب کی گرم بازاری
مبارک رہے، تو نے پردۂ راستی[1] کو
پردۂ مخالف[2] کر دیا۔ اس کے بعد
میرے لیے راہ عراق[3] ہی بہتر ہے۔

---

[1] ایک نغمہ کا نام ہے [2] یہ بھی ایک نغمہ ہے [3] عراق بھی ایک نغمہ ہے، راہ بمعنی پردہ، معنی یہ ہے، تمہارے یہاں سچائی کے بجائے عناد و مخالفت کا دور دورہ ہے، پس میرے لیے عراق چلے جانا ہی اچھا ہے۔

اگرچہ شیراز نامہ ص ۸۲ میں ماخذ کا ذکر نہیں لیکن اس کا حسب ذیل بیان مصاف حضرت سے ماخوذ ہے، خواجہ امام جاری جن کی کنیت ابو نصر تھی اتابک (ابو بکر) کا امام اور استاد تھا اور علوم شرعی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، عربی زبان اور ادبیات میں بڑی دستگاہ بہم پہنچائی تھی، مشائخ، صلحا اور گوشہ نشینوں کا بہت معتقد تھا، ان لوگوں کی تربیت اور نگرانی کا فریضہ اس کے ذمہ تھا اور وہ ان کے ذکر خیر سے دریغ نہیں کرتا تھا، اس طرح لوگ اس کی بات کو بہت مانتے تھے، چونکہ وہ علوم شرعی کا ماہر تھا تو اس نے اتابک کے دل میں یہ بٹھا رکھا تھا کہ علما و طلبہ کی وہ جماعت جو علوم حکمت واصول میں مہارت رکھتی ہے، ان کا درس و دور سنت و جماعت کے طریقے کے خلاف اور شیراز کے لوگوں کی گمراہی اور بد اعتقادی کا موجب ہے، (پس) اتابک نے اس جماعت کے شیراز سے اخراج کا حکم صادر کیا، ان میں ایک مولانا صدر الدین اشنہی ہیں کہ "استحضار و استبصار او بہ کلیات علوم عقلی و نقلی چو بیاض نہار و ریاض بہار از اقامت بیان استغنا داشت و در علوم الٰہیات و طبیعیات و ہندسہ و جبر ولیات سعی فرمود و این جملہ را درس گفتی و متبحر بودی" اور ان کے علاوہ امیر شہاب الدین تورہ پشتی و مولانا عز الدین قیسی اور ائمہ کی ایک جماعت کو بھی شہر شیراز سے اخراج کر دیا۔

ان جلا وطن کیے ہوئے علما میں ایک شہاب الدین تورہ پشتی بھی تھے، ان کے نکالے جانے کی وجہ سے محققین کو الجھن ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ مشائخ میں تھے، کئی کتابوں کے مصنف، مجمل فصیحی میں بذیل واقعات سنہ ۶۶۱ھ[1] ہے، وفات

---

[1] بخش ۲ ص ۳۳۰-۳۲۹، اس کتاب میں انکے تین بیٹوں اور ان کے بیٹوں کا حاشیہ ص ۳۴۳

شیخ الحفاظ، افتخار المحدثین شیخ شہاب الملۃ والدین فضل اللہ التورانشتی[1] شارح کتاب المصابیح و مصنف المعتمد فی المعتقد وغیرہ، بکرمان۔ نجیب مائل ہروی[2] نے لکھا ہے کہ المعتمد فی المعتقد جو عقاید و اثبات صفات خداوند و شرح اسماء و کلام خدا و قضا و قدر و ایمان و کفر کے بارے میں ہے اور خود آتابک ابوبکر بن سعد زنگی کے نام معنون ہے۔ ظاہر ہے ایسے شیخ کے بارے میں اتنی سوء ظنی کہ خود جس حکمران کے نام کتاب معنون ہو، وہی شیخ کے جلاء وطن کا فرمان جاری کرے۔

صدرالدین محمد اشنہی صاحب تصنیف بزرگ ہیں، ان کی ایک کتاب "تحفہ اہل الوصول" موجود ہے اور کچھ عرفانی اشعار ترجمہ عوارف میں نقل ہیں:

۱- تحفۃ اہل الوصول فی علم الفصول: شیخ صدرالدین اشنہی کی تقریر و تحریر کا مجموعہ، اس کا موضوع توحید، سماع، وفات نبی کریمؐ اور مذمت دنیا جس کے مرتب اسماعیل بن عبدالمومن بن اسماعیل بن عبدالجلیل بن ابی منصور ماشادہ ہیں، جنھوں نے محمد اشنہی کی وفات کے بعد اسے مرتب کیا، اس کے ایک نسخے کے بابت نجیب مائل ہروی نے خبر دی ہے۔ قاسم انصاری نے ترجمہ نے کتاب کے مقدمہ

(حاشیہ ص ۳۴۱) پوتوں تک کے نام درج کیے ہیں۔ اس طرح:

شہاب الدین فضل اللہ
- تاج الدین عبداللہ
  - کمال الدین
    - نظام الدین محمد
      - تاج الدین عبداللہ
- صدرالدین عبدالعزیز (لاولد)
- مجدالدین عبدالرحمن
  - شہاب الدین فضل اللہ
    - رکن الدین سلیمان
      - صدرالدین عبدالعزیز
  - برہان الدین عبدالمومن
    - عماد الدین عبدالسلام
      - (عم شیخ زادہ صدرالدین)
        - عبدالعزیز ندیم
          - (امیر مبارز الدین محمد)

[1] اس کے جانشین اور توشہ کے لیے دیکھیے حواشی قزوینی شد الازار، نیز دیکھیے: ہزار مزار ص ۳۰۰ حاشیہ ۲۔
[2] ڈاکٹر مائل ہروی نے اسے طبع کر دیا ہے۔ مطبوعہ نسخے کے مقدمے سے یہ اطلاع لی گئی ہے۔

ص ۲۰۸ میں علت تالیف کے ذیل میں لکھا ہے کہ چون امام شیخ شیوخ الاسلام حجۃ اللہ علی الخاص والعام، سلطان المحققین... ابو محمد محمود بن خداداد بن ابی بکر یوسف اشنہی وفات یافت.. فصولی چند کہ از بہر مبتدیان بروی اقتراح کردہ بودند بدست این ضعیف اسماعیل بن عبدالمومن بن اسماعیل بن عبدالجلیل بن ابی منصور ماشادہ احسن اللہ عاقبۃ امرہ افتاد۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبارت بالا میں اصل مصنف یعنی صدرالدین محمد پسر ابو محمد محمود کا نام درج ہونے سے رہ گیا۔ اس لیے کہ تحفۃ اہل الوصول کے مصنف صدرالدین محمد اشنہی تھے نہ انکے باپ، صحیح مصنف کا نام خود مصحح عوارف نے ص ۲۹ پر اس طرح لکھا ہے:

"و تالیف کتاب تحفۃ اہل الوصول را بمنظور حفظ مقداری از آثار صدرالدین شیخ اشنہی انجام داد۔"

۲- اشعار جو باقی رہ گئے ہیں: صدرالدین اشنہی شاعر تھے اور انکی عمدہ رباعی جسکا مخاطب آتابک ابوبکر بن سعد ہے، اوپر درج ہو گئی۔ انکے کچھ اشعار اسماعیل بن عبدالمومن نے ترجمہ عوارف میں محفوظ کر دیے ہیں، یا تم نے اپنے مقالہ: ترجمۂ عوارف المعارف از اسماعیل بن عبدالمومن میں یکجا کر دیے تھے، دوبارہ نجیب مائل ہروی نے انھیں مجموعہ آثار فارسی ص ۱۵-۱۶، جمع کر دیے ہیں، یہ سارے اشعار سادہ مگر عارفانہ ہیں: پہلی غزل ملاحظہ ہو:

فلک قدر ترا ز یبد رسالت ... زرویت تافتہ نور جلالت
ز خلق تو گرفتہ بوی در مشک ... ز رشک تو مہ نو در خجالت
چو بر گردون گذر کردی ملک گفت ... بنام ایزد زہی جاہ و جہالت
چو پای خود نہادی بر سر عرش ... بہ بانگ آمد کہ آیا این چہ حالت
مرا تاجی چنین کی بود کامشب ... کہ با شم من کہ در یابم وصالت
گہہ آنست کز حضرت بخواہی ... مراد خود چو ہست اکنون بحالت
بخواہ آنہا کہ می خواہی ز حضرت ... محبت خوش کند تا زود لالت
سلام حق بگوش سر تو بشنو ... نظر کن در جمالش بی ملالت
مشنوی چون سراید مدحت تو ... کہ بس تنگ است میدان مقالت

(ترجمہ عوارف باب گیارہ دوم)
(باقی)

برصغیر میں قرآن حکیم کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ

از ڈاکٹر وفا راشدی۔ کراچی، پاکستان

حضرت مخدوم نوح سرور ہالائی سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے دسویں صدی ہجری میں "القرآن الحکیم" کا مکمل ترجمہ مع تفسیر فارسی زبان میں کیا۔ یہ نہ صرف سندھ بلکہ پورے برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ ہے[1]۔ اس نسخے کو پاکستان کے مشہور قومی و علمی ادارہ سندھی ادبی بورڈ نے ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء میں

[1] اس ترجمے کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب "وحی منظوم" مصنفہ علامہ سیماب اکبرآبادی (مطبوعہ سیماب اکیڈمی کراچی ۱۹۸۱ء) کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"دہلی سے عرصہ ہوا فارسی کے دو ترجموں والا قرآن پاک شایع ہوا تھا ان میں سے ایک ترجمہ شیخ سعدی سے منسوب کیا گیا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ترجمہ حضرت علی ابن محمد المعروف میر سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) کا ہے اور دوسرا ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ) کا ہے لیکن شاہ صاحب سے پہلے مخدوم نوح ہالائی (المتوفی ۹۹۸ھ) نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا جس کا ایک پارہ راقم (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں) نے ۱۳۸۱ھ میں شایع کیا تھا۔"

اس وقت کے چیرمین ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی کی نگرانی میں نہایت اہتمام سے شایع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہی فارسی زبان میں اس نسخے کی تقدیم، تحشیہ و تصحیح کے فرائض بطریق احسن انجام دیے ہیں۔ اس قرآن مجید کی طباعت و اشاعت انتہائی نفیس، صوری و معنوی اعتبار سے معیاری اور دلکش انداز میں ہوئی ہے جس سے ادارے کے قرآنی و دینی علوم سے شغف اور اعلیٰ کارکردگی کے نہج کا پتہ چلتا ہے۔

"القرآن الحکیم" کے زیر نظر مطبوعہ نسخے کی کل ضخامت بڑے سائز پر ۱۲۶۰ صفحات ہے۔ جس میں سے عربی متن (یعنی اصل قرآن) ۶۱۰ صفحات پر اور فارسی ترجمہ و تفسیر بھی اتنے ہی صفحات یعنی ۶۱۰ پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کا مبسوط و مفصل مقدمہ ہے جو چالیس صفحات پر محیط ہے۔

ساتویں صدی ہجری یعنی حضرت مخدوم نوح کے ترجمہ سے پہلے کی صدیوں میں علماء و فقہائے ہند نے اپنے اپنے عہد میں قرآن شریف کے فارسی ترجمے کیے لیکن یہ تمام کے تمام ترجمے چند سورتوں اور آیتوں تک محدود تھے۔ مثلاً علامہ شمس الدین دولت آبادی ثم الدہلوی کی تفسیر بحر الامواج نویں صدی ہجری کی تالیف ہے یہ سورۂ فاتحہ سے سورۂ انعام تک ہے۔ علامہ ابوالفضل (متوفی ۹۵۰ھ) نے بھی دسویں صدی کے وسط میں تفسیر آیۃ الکرسی لکھی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی نے اپنے مقدمے میں ان تفاسیر کے علاوہ کتب خانہ آصفیہ کے حوالے سے جن قلمی نسخوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں شیخ نظام الدین تھانیسری کی تفسیر فارسی ریاض القدس پارہ عم، نا معلوم مترجم کی تفسیر سورۃ الملک و سورۃ المدثر اور حضرت

شاہی کی تفسیر سالم الاسرار ہے۔

دسویں صدی ہجری میں حضرت مخدوم نوح ہالائی کے مکمل فارسی ترجمے کے بعد گیارہویں صدی ہجری سے علمائے کرام نے ترجمہ و تفسیر کی طرف زیادہ توجہ دی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم نے معاشرے کی اصلاح و تطہیر کی خاطر تحقیق و تفہیم کے ساتھ درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا۔ وہ سبق کے طور پر مطالب قرآن بیان فرماتے اور آیات قرانی کی روشنی میں مسائل زندگی پر بحث کرتے، قرآن کے متن کو لفظ بہ لفظ ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ سمجھاتے، حضرت شاہ عبدالرحیم کا نظریہ یہ ہے کہ قران حکیم ایک فن کی کتاب ہے۔ اہل علم حضرات کو اس فن میں کامل دسترس ہونی چاہیے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے نامور فرزند حضرت شاہ ولی اللہ (وفات ۱۱۷۶ھ) نے اپنے والد کے طریقے کو اختیار کیا۔ شاہ صاحب نے ۱۱۵۱ھ میں فتح الرحمٰن کے نام سے قرآن مجید کا مکمل فارسی ترجمہ بارہویں صدی ہجری میں کیا۔

تیرہویں صدی ہجری میں جو تفسیر مشہور ہوئی وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خلف الرشید حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ) کی تفسیر فتح العزیز معروف بہ تفسیر عزیزی ہے۔ یہ تفسیر مکمل نہیں۔ صرف سورہ بقرہ اور پارہ عم پر مشتمل ہے۔

حضرت مخدوم نوح ہالائی علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ قرآنی آیات کی تفسیر و تفہیم اور احادیث نبوی کی توضیح و تشریح سہل اور آسان الفاظ میں ایسے

دلآویز پیرایے میں بیان فرماتے کہ اس عہد کے بڑے بڑے علما و فقہا بھی ان کی ذہانت و ادراک اور تبحر علمی کے مداح و معترف ہو جاتے۔ ان کے درس و تفسیر کی شہرت اتنی زیادہ تھی کہ دور دور سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے مسائل تصوف کے ساتھ مسائل حاجات کا حل دریافت کرتے اور ان کی بارگاہ سے فیضیاب ہو کر اٹھتے۔ حضرت مخدوم نوح ہالائی کی دینی علمی و قرآنی خدمات کا اندازہ ان کے ملفوظات مکتوبات ارشادات کے علاوہ ان کے ترجمہ و تفسیر قرآن سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے بلکہ صرف زیر تبصرہ ترجمۂ قرآن ہی ان کی عظمت کے لیے کافی ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی[1] حضرت مخدوم نوح ہالائی کے اس مکمل فارسی ترجمے کی بے شمار خوبیاں ہیں۔ یہاں چند خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ قدامت میں اسے شرف اولیت حاصل ہے۔

۲۔ اس میں مقطعات و متشابہات کے اسرار و رموز کے واضح اشارے ہیں۔

۳۔ ہر صفحے کی داہنی طرف قرآن کریم کا اصل متن ہے۔ اس کے بالمقابل ہر صفحے پر ہر آیت کا سلیس اور جامع ترجمہ ہے۔ ساتھ ہی متشابہ آیات کی تاویل و تشریح بھی۔ حاشیے میں آیات کی تصریح، محاوروں، استعاروں پر مبنی لفظوں اور جملوں کی تحقیق بھی شامل ہے

---

[1] یہ عاجز نعیمہ (وقار راشدی) کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی جیسے استاد معظم کی براہ راست رہنمائی اور ان کے "مقدمہ" کی روشنی میں حضرت مخدوم نوح ہالائی کے ترجمہ فارسی کے بارے میں یہ چند سطور قلمبند کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

۴۔ بین السطور میں مسائل کا حل ترجمہ میں اس خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے کہ کسی اور ترجمے یا تفسیر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

۵۔ ترجمے کی زبان اس قدر سہل اور آسان ہے کہ عالم و غیر عالم سب ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۶۔ ایک سو چودہ سورتوں کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ایک سو چودہ مرتبہ جو ترجمہ کیا گیا ہے ہر ترجمہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح ہم معنی آیتوں کے ترجمے بھی مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں کیے ہیں۔ یہ جدت فارسی کے کسی دوسرے ترجمے میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ خصوصیت اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت نے مترجم کو ترجمہ کے فن میں بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا اور وہ فارسی زبان و ادب پر بے مثال دسترس رکھتے تھے۔

۷۔ ترجمہ و توضیح میں اسلاف مفسرین و محدثین کے طریقوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۸۔ ترجمے کے ضمن میں مختصر تعلیقات سے معانی و مطالب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی فتح الرحمٰن کے ترجمہ و تعلیقات میں یہی انداز اختیار کیا تھا اور طباعت کے وقت ایسے ہی تعلیقات حاشیے میں شامل کیے گئے۔

قرآن مقدس اور اس کے ترجمہ و تفسیر کا اصل نسخہ مترجم و مفسر حضرت مخدوم نوح ہالائی کے زیر نگرانی ان کے مرید و خلیفۂ خاص حضرت بہاء الدین گودڑیہ ٹھٹوی نے لکھا تھا۔ وہ ٹھٹھ کے میمن قوم کے فرد تھے۔ حضرت مخدوم اور ان کے مریدین بہاء الدین گودڑیہ کا احترام کرتے۔ بہاء الدین گودڑیہ کے عقید تمندوں میں سندھ کے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے جد امجد (حضرت مخدوم نوح کے خلیفۂ خاص

حضرت شاہ عبد الکریم بلبڑی والے (متوفی ۱۰۳۲ھ) بھی تھے۔ سندھ ہی کے عظیم المرتبت صوفی شاعر حضرت قاضی قاضن (متوفی ۹۵۸ھ) حضرت مخدوم نوح کے ہم عصر تھے۔ قاضی قاضن اور شاہ کریم دونوں وادی مہران کی برگزیدہ علمی و دینی شخصیات تھے۔[1]

یہ نسخہ دو خطوں میں لکھا گیا۔ خط قرآن مقدس سیاہی میں، ترجمہ سرخی میں، ہر سطر کے نیچے ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی مقدمہ (ص ۱۵) میں تحریر فرماتے ہیں کہ "پہلے یہ خیال تھا کہ اسی نسخے کو آفسٹ میں چھاپا جائے لیکن خط قرآن رسم الخط مصحف عثمانی کے مطابق نہ تھا اور اس میں بہت سی غلطیاں تھیں لہذا اس ارادے کو ترک کر دیا گیا۔ اول تا آخر نسخے کی از سر نو کتابت کرائی گئی اور اس کی طباعت آفسٹ میں عمل میں آئی۔

اصل نسخے کے ورق اول میں جو عبارت درج ہے اس سے اسکا یہ سن کتابت معلوم ہوا:

"بدانکہ بعد از آوردن کرخی از شہر تستر مورخہ بست و ہفتم ماہ شعبان در نوشتن ترجمہ بعد شروع کردم در تاریخ سنہ ۱۰۱۱ھ بفضل و کرم امید کہ بحرمت قرآن و حرمت نبی آخر الزماں جملہ ترجمہ بخیر و سلامت تمام کرد آمین آمین۔[2]

قرآن کریم اور حضرت مخدوم نوح کے ترجمہ مع تفسیر کا یہ اصل نسخہ درگاہ سرور ہالا کے موجودہ ذی علم و فضل سجادہ نشین سندھ حضرت مخدوم

---

[1] ملاحظہ ہو ابیات شاہ کریم مترجمہ ڈاکٹر نجم الاسلام مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھالاجی سندھ یونیورسٹی جام شورو ۱۹۸۷ء۔ [2] ذکر برخی از تراجم و تفاسیر قرآن در زبان فارسی از علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی ص ۱۵، ۱۶

محمد زماں طالب مولی کی ملکیت ہے۔ ان ہی کی تحریک پر ڈاکٹر قاسمی نے اسے مدون کیا۔ اس نسخے کی کتابت سنہ ۹۱۱ھ میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ پانچ سو سالہ پرانا نسخہ ہے پانچ صدیاں گزرنے کے بعد اس کے کاغذ کا خستہ و خراب ہونا، رنگ کا بدلنا، حروف کا مدہم ہونا اور اکثر حصوں کا ناقابل خواندہ صورت میں موجود ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ ان حالات میں ڈاکٹر صاحب کو مخطوطہ پڑھنے، تصحیح کرنے، صاف کرنے اور کتابت و طباعت کے لائق بنانے میں بڑے دشوار گذار مرحلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ تاہم انھوں نے مخطوطہ شناسی عربی و فارسی علوم اور زبانوں میں مہارت، ترجمہ و تفسیر کے فن سے دلچسپی اور دین سے گہرے تعلق کی بنا پر کئی سال کی شب و روز محنت شاقہ عرق ریزی اور دیدہ وری کے بعد ہر قسم کی مشکلات پر قابو پالیا اور تکمیل کے آخری نکتے پر پہنچ کر دم لیا۔

عربی متن کے ہر صفحے کے سامنے فارسی ترجمہ و تفسیر آیت بہ آیت نمبروار لکھی گئی ہے۔ عربی و فارسی دونوں کی کتابت نفیس ہے، خطوں اور سطروں میں یکسانیت و ہم آہنگی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے اپنے مقدمہ کے آغاز میں قرآن مقدس کے نزول سے لے کر اب تک کے اس کے قلمی نسخوں اور ساری دنیا میں بتدریج اس کی ترویج کی تاریخ نیز قرآن حکیم کی فضیلت اور علوم قرآنی کی اشاعت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنے موضوع کی وضاحت اس قسم کے عنوانات کے تحت کی ہے۔

۱۔ جمع آمدن قرآن بوسیلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی

۲۔ شروط تفسیر قرآن مقدس

۳۔ تفسیر آیات متشابہات ۴۔ مسئلہ نسخ در قرآن۔

"ذکر برخی از تراجم و تفاسیر قرآن در زبان فارسی" کے زیر عنوان ان تمام تراجم و تفاسیر کا اجمالی احاطہ کیا ہے جو تبلیغ قرآن کے ابتدائی دور سے لے کر حضرت مخدوم نوح ہالائی (متوفی سنہ ۹۹۰ھ) اور ان کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ ان کی اولاد اور ان کے عہد کے دیگر علماء و فقہا کے توسط سے معرض وجود میں آئیں۔ غرض ڈاکٹر قاسمی نے علمائے عرب و عجم کے فارسی ترجموں اور تفسیروں کا تذکرہ کر کے اس ترجمہ و تفسیر کی خوبیاں اور خصوصیات پوری طرح نمایاں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو اس خدمت قرآنی کی بہترین جزا دے۔

خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب۔ ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پھلواری شریف پٹنہ

اس مضمون کا عنوان اقبال کے مجموعۂ کلام "بانگ درا" کی غزلیات حصہ اول (..... ۱۹۰۵ء تک) کے درج ذیل شعر کا ایک مصرعہ ہے، جو غزلیں انھوں نے لاہور کے مقامی کالج کی طالبعلمی کے زمانہ میں کہی تھیں ؎

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ! خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

اقبال نے اس شعر کے پہلے مصرعہ میں واعظوں کو اپنے طنز کا نشانہ اس لیے بنایا ہے کہ "استواء علی العرش" کے فقرے کے جو معنی وہ پہناتے ہیں اور خدا کے عرش پہ جلوہ فرما ہونے کی باتوں کو جس طرح وہ پیش کرتے ہیں اس سے عام انسانوں کے ذہن میں خدا سے دوری کا احساس جاگزیں ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی خدا اور انسان کے رشتوں کا صحیح تصور ان کے سامنے نہیں آپاتا۔ اقبال نے انہی احساسات اور تصورات کی تردید، قرآنی معنوں میں، اس مصرعہ میں کی ہے اور دوسرے مصرعہ میں اس تردید کے جواز میں خدا کے انسان سے قریب تر ہونے کی بات کو ایک مسلمہ بنا کر پیش کیا ہے جو ان کا اس شعر میں اصل مقصد ہے۔

جہاں تک خدا کے عرش پر مستوی ہونے کی باتیں ہیں ایسی چند قرآنی آیات کے ترجمے درج ذیل ہیں جن میں "استواء علی العرش" کا ذکر وارد ہوا ہے:۔

"درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا (ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ)۔ (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۷)" حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ تخت سلطنت پر جلوہ گر ہو کر کائنات کا انتظام چلا رہا ہے (ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ)" (سورہ یونس ۱۰۔ رکوع ۱) "وہ رحمٰن (کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے (اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى)"

(سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۵)

خدا کے "استواء علی العرش" (تخت سلطنت پر متمکن ہونے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا تو مشکل ہے۔ مگر اس کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد کہیں بے تعلق ہو کر بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرماں روائی کر رہا ہے اس طرح قرآن اس بنیادی غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خودسری کی ضلالت میں۔ اس طرز بیان سے قرآن جس دائمی و ابدی حقیقت کو پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں بادشاہی صرف ایک ذات کی ہے اور

حاکمیت جس شے کا نام ہے وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان اسے واحد معبود مانتے ہوئے سیاسی و تمدنی معنوں میں بھی اس کی حاکمیت کو تسلیم کرے۔ اسی لیے فرمایا گیا :-

• خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ (اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ)

(سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۷)

متذکرہ بالا فقرے میں "استوار علی العرش" کی ہمیں مزید تشریح ملتی ہے جو پہلے مجملاً بیان کیے گئے ہیں۔ یعنی یہ کہ خدا محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔

"استوار علی العرش" کی اس مختصر سی تشریح و توضیح کی روشنی میں اقبالؔ نے زیر تجزیہ شعر کے دوسرے مصرعہ میں خدا اور انسان کے رشتوں کو ایک مسلمہ بنا کر پیش کیا ہے اور وہ مسلمہ یہ ہے کہ جب انسان کا خالق خدا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جو ہستی کسی چیز کی خالق ہو وہ اپنی مخلوق سے اس کی تخلیق کے بعد بے تعلق ہو کر دور جا بیٹھے اور اس سے محبت و شفقت نہ رکھے اور پھر جب اس خالق نے اپنی اس مخلوق کے لیے ایک روشن راہ کھول رکھی ہے تو وہ کیوں نہیں اپنی مخلوق کی آئے دن کی کارگزاریوں سے باخبر رہنا پسند کرے گا۔ چنانچہ اس دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے بلا واسطہ ان بہت سی آیات کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے جن میں خدا نے قرآن میں مختلف مقامات اور مختلف مواقع پر اس دوری کی غلط فہمی کی خود تردید کی ہے اور بار بار یہ باور کرایا ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے قریب ہی نہیں بلکہ اس کے لیے کتنا رحیم و کریم و شفیق بھی ہے۔ چند ایسی آیات کے ترجمے ذیل میں درج ہیں :-

"اور اے نبیؐ، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انھیں

بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ (یہ بات تم انھیں سنا دو) شاید کہ وہ راہ راست پالیں" (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۸۶) "ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں" (سورہ قٓ ۵۰۔ آیت ۱۶) "وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب بھی ہے (اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ)" (سورہ سبا ۳۴۔ رکوع ۶) "اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو بآواز بلند کہی جاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چھپا کر کرتے ہو"

(سورۃ الانبیاء ۲۱۔ آیت ۱۱۰)

"کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے" (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۱)

"وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے ..... یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۳)

"اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ..... وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے ..... اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ...... جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے" (سورۃ الحدید ۵۷۔ رکوع ۱)

• جہاں بھی تم ہو گے، اللہ تمہیں پا لے گا۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ..... اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے ..... تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، کفران نعمت نہ کرو"

(سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۱۸)

اس سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ خدا نے انسان کو صرف پیدا کر کے ہی نہیں چھوڑ دیا اور وہ ہر وقت اس سے صرف قریب ہی نہیں ہے بلکہ اس نے اس کی رہنمائی کا بھی ذمہ اپنے سر لیا ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اس قربت کا حق کیونکر ادا کر سکتا ہے اور اس کی طرف رجوع ہو کر ایک دوسرے میں باہم دیگر ہونے کی کیا صورت ہے۔ خدا نے اس کی بھی نشاندہی قرآن میں مختلف مواقع پر مختلف طریقے سے کی ہے۔ جیسے کئی مواقع پر فرمایا گیا:۔

"یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے انکے عمل کی دوہری جزا ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے"

(سورہ سبا ۳۴۔ آیت ۳۷) "(اے نبیؐ) کہو: "اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے" (سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۴)

"وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیتا ہے" (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۳)

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے" (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۹)

چونکہ عام انسانی ذہن خدا کی ہستی کا تصور آسانی سے نہیں کر سکتا اس لیے خدا سے قریب تر ہونے کی واحد سبیل جو قرآن مجید میں وارد ہوئی ہے وہ رسول اللہؐ

کی پیروی ہے۔ ایک موقع پر فرمایا گیا:۔

"اے نبیؐ، لوگوں سے کہدو کہ: "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ ان سے کہو کہ: "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرو۔" پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں" (سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۴)

اقبال نے انہی آیات کی ہو بہو ترجمانی "بانگ درا" کی نظم "جواب شکوہ" کے اس شعر میں کی ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں   یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسی پس منظر میں دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی قربت حاصل کرنے کے لیے اتباع رسولؐ کی اہمیت ایک موقع پر اس طرح بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے:۔

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا (اُسوَۃٌ حَسَنَۃٌ) ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے" (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ آیت ۲۱)

زیر تجزیہ شعر کے دوسرے مصرعہ میں جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ: "خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے" تو وہ خدا اور انسان کے رشتوں کو قرآن کے پس منظر میں استوار کرنے کی تلقین کرتے ہیں جس طرح استوار کرنے کی ہدایت خدا نے دی ہے۔ جہاں تک احتراز کرنے کی بات ہے تو خدا اپنے ایسے بندوں سے

ضرور احتراز کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع نہیں کرتے یا اس کی خاطر مجاہدہ نہیں کرتے۔ اس لیے خدا نے ایسے بندوں سے احتراز کرنے کا ایک کلیہ سورہ آل عمران ۳ کے رکوع ۴ کی آیات میں (جو اس مضمون میں گزر چکی ہیں) صاف طور پر یہ مرتب کر دیا ہے کہ جو خدا کے عاشق بننے کا دعویٰ کرتے یا اس سے قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں پہلے رسول اللہؐ کا عاشق بننا ہوگا اور آپؐ کی دعوت قبول کرنی ہوگی، اور اگر وہ آپؐ کی دعوت قبول نہیں کرتے تو خدا صاف طور پر احتراز کی توجیہ بھی یہ کہہ کر پیش کر دیتا ہے کہ:۔

"پھر اگر وہ تمہاری (یعنی رسولؐ کی) دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں"۔

خدا سے قربت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تزکیہ نفس کے ذریعے مسلک عشق اختیار کرنے پر منحصر ہے۔ یہ جذب کر لینے اور اپنے آپ میں سمو لینے کی خواہش کا دوسرا نام ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ کی سیرت میں جذب کر لینے والے عمل کا سبق موجود ہے۔ عشق کے بغیر خودی یعقوبؑ کا وہ بیت الحزن ہے جس میں وہ اپنے یوسف گم گشتہ کے فراق میں تڑپ رہا ہو۔ اس بیکراں کائنات میں عشق ہی وہ قوت ہے جو استعداد یعنی قوت پیدا کر دیتی ہے کہ زمین و آسمان کا فاصلہ ایک ہی جست میں طے پا جاتا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
("بال جبریل" غزل ۱۴)

اسی عشق کی بدولت جب مظاہر پرست آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور انسان حسن مطلق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے تو صرف کائنات کا طلسم ہی ٹوٹ نہیں جاتا بلکہ "استواء علی العرش" کے سارے عقدے خود بخود حل ہو جاتے ہیں اور جسے انسان عرش پر متمکن سمجھتا تھا اسے اپنے خانۂ دل میں ہی پا لیتا ہے

ہوئی جو چشم مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے
("بانگ درا" "سرگزشت آدم")

مصر کے مشہور ادیب و صحافی احمد حسن الزیات

از
جناب ابوسفیان اصلاحی شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ہفت روزہ مجلہ "الرسالہ" کے ایڈیٹر احمد حسین الزیات گو عظیم ادیب و مصنف نہیں ہیں تاہم اس ادبی مجلہ کی بدولت ان کو غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی، جس کے صفحات مصر کے ادیبوں، نقادوں اور شعرا کی نگارشات کے لیے وقف ہوتے تھے، بہت سے اہل قلم اسی رسالہ کی وجہ سے ادبی حلقوں میں روشناس ہوئے، اس مضمون میں ان کے حالات و کمالات پر بحث و گفتگو کی جائے گی۔

مختصر حالات احمد حسین الزیات "طلخا" کی ایک چھوٹی سی بستی "کفر دمیرۃ القدیم" میں ۱۸۸۵ء[1] (۱۶ ربیع الاول ۱۳۰۸ھ) کو پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم "طلخا" میں ہوئی۔ اس کے بعد قاہرہ آ کر جامعہ ازہر میں داخلہ لیا جہاں عربی اور دینی علوم حاصل کیے۔ پھر قدیم مصری یونیورسٹی گئے۔ مدرسۃ "الفریر" میں بھی عربی کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ مدت قاہرہ کے "مدرسۃ الحقوق الفرنسیۃ" میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں قیام کے دوران فرانسیسی زبان بھی سیکھی، آخری امتحان پیرس میں ۱۹۲۵ء میں دیا۔

---

[1] احمد حسین الزیات کے لڑکے کے مطابق انکی تاریخ پیدائش ۱۸۸۶ء ہے اسکے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ "الاعلام" دار العلم للملایین۔ الطبعۃ الخامسۃ۔ بیروت ۱۹۸۰ء ص ۱/۱۱۳

احمد حسن الزیات بعض سرکاری اسکولوں میں عربی زبان و ادب کے درس و تدریس کی خدمت پر مامور رہے۔ ۱۹۲۹ء میں بغداد کے "دار المعلمین العلیا" میں انہیں شعبۂ عربی ادب کا صدر مقرر کیا گیا جہاں اپنے سہ سالہ قیام کے دوران انھوں نے "العراق کما عرفتہ" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی لیکن اشاعت سے قبل ہی اسے نذر آتش کر دیا۔ ۱۹۳۲ء میں مجلہ "الرسالہ" نکالا جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۳ء تک بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس کے بند ہونے کے بعد "الروایۃ" نکالا جو تھوڑی ہی مدت بعد بند ہو گیا۔[1]

تدریس کے دوران میں انھوں نے عربی ادب کی ایک مختصر تاریخ "تاریخ الادب العربی"[2] کے نام سے تصنیف کی جو بہت مقبول ہوئی۔[3] اس کی اور دو فرانسیسی قصوں کے ترجمے کی اشاعت کے بعد ان کی شہرت بہت بڑھ گئی، ان میں سے ایک ترجمہ جرمنی شاعر گوئٹے کے "آلام فرتر" کا اور دوسرا فرانسیسی شاعر "لامرتین" کے "رفائیل" کا تھا۔ یہ دونوں ترجمے کے بجائے طبع زاد معلوم ہوتے تھے۔[4]

علمی اعزاز احمد حسین الزیات خداداد صلاحیتوں کی بنا پر "المجمع العلمی" دمشق کے صدر کرد علی (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۵۳ء) نے پہلے انھیں ۱۹۲۶ء میں اکیڈمی کی ممبر شپ

---

[1] مجلہ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۶۷۶ و المحافظۃ و التجدید فی النثر العربی ص ۲۶۵ مزید دیکھیں الاعلام ۱/ ۱۱۴ [2] تاریخ الادب العربی کے دو ترجمے اردو میں ہوئے ایک ڈاکٹر طفیل احمد مدنی کا ہے جو ایمان کمیٹی الٰہ آباد سے پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا اور دوسرا عبد الرحمان طاہر سورتی کا ہے جو ۱۹۶۱ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ [3] مجلہ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۶۷۶ [4] ایضاً ص ۶۷۷۔

قبول کرنے کی دعوت دی اور جون ۱۹۲۷ء میں ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ان کا شاندار اور شایان شان خیر مقدم کیا۔[1]

۱۹۴۹ء میں قاہرہ کی "مجمع اللغۃ العربیۃ" کے ممبر ہوئے۔ ان کا شمار اس اکیڈمی کے ممتاز ممبران میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مختلف علمی کمیٹیوں مثلاً "لجنۃ تیسیر الکتابۃ" "لجنۃ الفاظ الحضارۃ" "لجنۃ معجم الفاظ القرآن الکریم" "لجنۃ الادب" "لجنۃ اللہجات" "لجنۃ الاصول" اور "لجنۃ المعجم الکبیر" وغیرہ کے بھی ممبر منتخب ہوئے۔ "المعجم الوسیط"[2] کی ترتیب کے لیے جب چار افراد پر مشتمل کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ان میں ان کا نام بھی تھا بلکہ یہی کمیٹی کے صدر مقرر کیے گئے تھے جن کی نگرانی میں یہ کام بحسن و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

۱۹۶۲ء میں وہ "المجلس الاعلی للادب و الفنون و العلوم الاجتماعیۃ" کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں "الجمہوریۃ العربیۃ المتحدۃ" نے انہیں "الدولۃ التقدیریۃ" کے ایوارڈ سے نوازا۔[3] ۱۹۶۳ء میں قدر دانوں کے اصرار پر "الرسالہ" کا دوبارہ اجرا عمل میں آیا لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے یہ پھر بند ہو گیا۔[4]

الرسالہ کے بند ہونے کے بعد تین سال تک مجلہ "الروایۃ" کی ادارت کا کام انجام دیتے رہے۔[5]

---

[1] مجلہ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۶۸۱ [2] المعجم الوسیط دو جلدوں پر مشتمل ہے جو "المکتبۃ العلمیۃ" طہران سے شائع ہوئی ہے جسے ابراہیم مصطفی۔ احمد حسین الزیات، حامد عبد القادر اور محمد علی النجار نے ترتیب دیا۔ [3] مجلہ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۶۸۱-۶۸۲ [4] ایضاً ص ۶۸۰ [5] احمد حسین الزیات۔ وحی الرسالہ۔ الطبعۃ الاولی۔ مطبعۃ الرسالہ ۱۹۵۶ء ۴/ ۳۶۷۔

پھر مجلہ "الازہر" کے ۱۳۷۲ھ سے ۱۳۷۴ھ تک مدیر رہے[1] جس میں عقائد پابندی سے
لکھتے رہے۔ انہیں ادبا اور شعرا کو اپنے گرد جمع کر لینے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔

الرسالہ کی بلند پائیگی

الرسالہ ادبی حیثیت سے بلند پایہ تھا جس کے گہرے اثرات
عربی زبان و ادب پر پڑے[2] اور اس نے الزیات کو شہرۂ آفاق شخصیت کا حامل بنا دیا
اس لیے اس کا مختصر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۳۲ء میں جب بغداد سے الزیات قاہرہ واپس آئے تو اس وقت یہاں
کوئی قابل ذکر ادبی رسالہ ایسا نہ تھا جو ارباب ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا۔[3]
اس بنا پر الرسالہ کے ذریعہ انھوں نے تمام عرب ممالک کے خیالات کی نمائندگی کرنے
کی کوشش کی، اس میں عرب قومیت اور اسلام کی حمایت پر خاص توجہ مرکوز کی گئی۔
انور الجندی کا کہنا ہے کہ اس پر عربی اور اسلامی رنگ غالب تھا۔ اس کو سیاسی جھمیلوں
سے کوئی تعلق نہ تھا، وہ قومی ادب اور فرعونی کلچر سے ہمیشہ برسرپیکار رہا۔ یہی
وجہ ہے کہ اس میں "علی ہامش السیرۃ" اور "عبقریۃ محمد" جیسی نگارشات شایع ہوئیں۔
محمود محمد شاکر، سعید العریان (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۶۴ء) اور کامل محمود حبیب وغیرہ نے
اس میں مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔ یہ تمام ادبا مصطفی صادق الرافعی کے
خیالات سے متاثر تھے۔ عبدالمنعم نے "مزامیر النفس العربیۃ" کے خلاف لکھا اور
طنطاوی (۱۸۷۰ء۔ ۱۹۴۰ء) نے عرب قومیت اور اسلامی اقدار کے خلاف
جو زہر اگلا تھا اسے رد کیا گیا۔ خود الزیات نے اسلامی اقدار پر اعلی چیزیں لکھیں

[1] الاعلام ۱/ ۱۱۳ [2] المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۶۵۵ [3] مجلۃ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۷۸ء) ص ۶۷۸۔

اور "عبقریۃ الاسلام" سے متعلق "شاتو بریان" کی تصنیف کی تردید میں ایک کتاب لکھی
الرسالہ نے "ہجرت" پر کئی خصوصی نمبر بھی نکالے۔

عرب قومیت اور اسلام کے مخالفین کے خلاف الرسالہ نے ہمیشہ علم بغاوت
بلند کیا۔ عرب قومیت کے سلسلے میں اس نے میانہ روی اپنائی، نیز یہ بھی کہا کہ
۱۹۳۳ء کے بعد بھی ہمارے طریقۂ کار میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور ہم مغربی نظریات
کو قبول کرنے میں غلو سے کام نہیں لیں گے[1]

الزیات کی متانت معاملات میں جلد بازی اور تشدد کو پسند نہیں کرتی تھی، اس
زمانے میں سیاسی مکتب فکر سے وابستہ بعض اہل قلم ثقافت فراعنہ اور جدیدیت کے
علمبردار تھے۔ اس مکتب فکر کے دو مصنفین کی جن دو کتابوں نے مصری معاشرہ
میں خاص طور پر بحران پیدا کر دیا تھا ان کے نام یہ ہیں "الشعر الجاہلی" اور "الاسلام
واصول الحکم"۔ الرسالہ میں نہ قدیم ادب سے استفادہ کو معیوب قرار دیا گیا اور نہ
جدید چیزوں کو تحقیق کے بعد قبول کرنے میں حرج تصور کیا گیا۔

"السیاسۃ" میں قدیم و جدید کے سلسلے میں جو نزاع برپا رہی وہ ایسی ہی تھی
کہ کسی عمارت کی تعمیر سے قبل ہی اسے منہدم کرنے پر غور کر لیا جائے۔ الرسالہ نے
قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی[2]
الرسالہ میں تاریخی، ادبی اور ثقافتی مسائل زیر بحث آتے۔ الزیات کو سیاست
سے کوئی دلچسپی نہیں تھی[3] الرسالہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے

[1] المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۶۶۰ [2] ایضاً ص ۶۵۵ [3] فی کتاب "ہذا مذہبی" بحوالہ المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۶۶۳ - ۶۶۵۔

لکھا ہے "ہمارا رسالہ سیاست سے پاک اور خالص ادبی مباحث پر مشتمل ہوگا اس میں اصحاب ذوق اور ارباب ادب کی تشفی اور قوم کی ہدایت و روشنی کا سامان ہوگا"[1]

الرسالہ کے مضامین میں تنوع ہوتا۔ تنقید، انشائیہ، شاعری، افسانے اور دوسرے جدید اصناف ادب اس کے دائرۂ تحریر میں شامل تھے۔

طٰہٰ حسین ۱۹۲۳ء میں "حدیث الاربعاء" کے عنوان سے مجلہ السیاستہ میں اموی اور عباسی عہد کے اسلامی معاشرے پر لکھ رہے تھے اور ۱۹۳۳ء میں "علی ہامش السیرۃ" کے عنوان سے الرسالہ میں لکھنا شروع کیا جو فنی اعتبار سے ایک نئی چیز تھی۔ رافعی، عقاد، عبدالرحمٰن شکری، عبدالوہاب عزام (۱۸۹۴ء۔ ۱۹۵۹ء) وغیرہ نے بھی بہت سے مقالات الرسالہ میں تحریر کیے[2] زکی مبارک نے "وحدت الوجود" اور فلسفیانہ نظریات کی تردید میں بہت سے مقالات لکھے۔ جواباً ان پر بھی تنقیدی مقالات شایع ہوئے[3] مشرقی عرب کی دوسری نسل کے ادیبوں میں سے بے شمار ادیبوں کی نگارشات الرسالہ کی زینت بنیں[4] رسول ایسی کتابیں قسط وار اسمیں شایع ہوتی رہیں[5]

الرسالہ کے بارے میں یہ بات بغیر کسی خوفِ تردید کے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنا ایک نیا طرز قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سے مقالہ نگاروں کی ایک ایسی جماعت وابستہ رہی جس نے مستقبل میں عربی ادب کی نمایاں خدمات انجام دی۔

---

[1] فی کتاب "ہذا مذہبی" بحوالہ المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی۔ ۵۹-۷۵۸ [2] ایضاً ص ۵۶-۶۵۷ [3] ایضاً ص ۶۶۲ [4] ایضاً ص ۶۶۳-۶۶۲ [5] ایضاً ص ۶۶۷۔

وفات احمد حسن الزیات کی باکمال شخصیت ۱۲ جون ۱۹۶۸ء کو دارفانی سے کوچ کر گئی۔ ۱۳ جون ۱۹۶۸ء کو قاہرہ میں نماز جنازہ ہوئی جس میں مختلف مکتب فکر کے نمائندوں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ اس کے بعد ان کی نعش ان کے مسقط الراس "کفر دمیرۃ القدیم" میں لائی گئی اور وہیں تدفین ہوئی[1]

وہ اگرچہ اب دنیا میں نہیں رہے لیکن الرسالہ میں شایع ہونے والے ان کے مضامین و مقالات ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

زیات کی مقالہ نگاری عربی مقالہ نگار کی حیثیت سے احمد حسن الزیات عظمت وانفرادیت کے حامل تھے۔ انھوں نے تین مجلات "الرسالہ" (۱۹۳۳-۵۳ء) "الروایۃ" (۱۹۵۴-۵۶ء) اور "الازہر" (۱۳۷۲-۱۳۸۲ھ) کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ انکے مقالات کی چار جلدیں "وحی الرسالہ" کے نام سے منظر عام پر آچکی ہیں اس کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا اصل رجحان ادب کی جانب[2] تھا جس کی اشاعت و فروغ ان کی زندگی کا مقصد تھا، اسی غرض سے انھوں نے اپنا مجلہ "الرسالہ" بھی نکالا تھا۔ المدرستہ الاعدادیہ میں تدریس کے زمانے ہی میں انھوں نے تصنیف وتالیف کے سلسلہ کا آغاز کر دیا تھا، الرسالہ کے اجرا کے بعد وہ ادیب کی حیثیت سے معروف ہوئے[3] انھوں نے بے شمار معاشرتی، مذہبی اور ادبی مقالات لکھے۔ وہ اسلامی وحدت کے بڑے حامی تھے۔ اس لیے ملت اسلامیہ کو ایک لڑی میں پرونا چاہتے تھے۔ دنیا کے کسی گوشے میں بسنے والے مسلمانوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد تصور کرتے۔ وہ

---

[1] مجلۃ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۶۸۲ [2] احمد حسن الزیات: وحی الرسالہ۔ الطبعۃ الاولی۔ مطبعۃ الرسالہ۔ ۱۹۵۶ء ۱۱۸/۴-۱۱۹ [3] ایضاً ۱۱۹/۴

خلافت عثمانیہ کے زبردست مؤید تھے۔ اسے مسلمانوں کی معراج تصور کرتے۔ ان کا ذوق دینی و مذہبی تھا۔ حمایت اسلام کے لیے ہمیشہ الرسالہ کے صفحات کو وقف رکھتے تھے۔

اسلام سے وابستگی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے عقاد، طٰہٰ حسین اور احمد امین کی طرح مغربی ادب کی اندھی تقلید نہیں کی۔ وہ مغربی علوم و فنون سے تجزیہ و تحلیل کے بعد ہی کوئی چیز اخذ کرتے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہمارا معاشرہ یورپ کی آغوش میں جا بیٹھا ہے اور ادیب حضرات انہیں کے نظریات کو عربی ادب میں فروغ دے رہے ہیں اس لیے یہ لوگ عربی ادب کی روح سے ناواقف ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ جدید ادب کی بے اعتدالیوں سے نالاں اور کلاسیکل ادب سے استفادہ کرنے پر زور دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مصطفیٰ صادق الرافعی کی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

الزیات نے اپنے مقالات میں عربی زبان و ادب کے ارتقاء اور ترویج و اشاعت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ عرب ممالک کو اس کی تاکید کرتے کہ عربی زبان سے ہمارا ماضی، ہماری تاریخ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا مذہب وابستہ ہے قرآن کریم اور حدیث شریف عربی زبان میں ہیں۔ اس لیے ہمیں بہرحال اس زبان سے نہ صرف اپنا رشتہ برقرار رکھنا چاہیے بلکہ اس کے مستقبل کو خوب سے خوب تر بنانے کی کد و کاوش بھی کرنی چاہیے۔ عربی زبان کے ساتھ ساتھ عرب قومیت کی حمایت میں بھی مقالات تحریر کرتے رہے۔ ان کے نزدیک عرب قومیت کو عام مصری قومیتوں پر برتری حاصل ہے۔

انھوں نے عربی موضوعات پر خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں انہیں دوسرے

ادباء سے محاذ آرائی بھی کرنی پڑی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ موجودہ صحافت زبان کے قواعد و ضوابط پر توجہ نہیں دے رہی ہے تو اس کے خلاف علم احتجاج بلند کیا۔ عبدالقادر مازنی اور عباس محمود العقاد نے الزیات کے مقابلے میں تردیدی مقالات سپرد قلم کیے[1]۔

احمد حسن الزیات کے مقالات مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ جن کو تین موضوعات ادبی، معاشرتی اور مذہبی کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ادبی مقالات | انھوں نے مختلف ادبی موضوعات کے علاوہ ادباء، شعراء اور ناقدین پر بھی اظہار خیال کیا۔ بہت سے انشائیے تحریر کیے۔ جدید و قدیم عربی ادب پر ان کی گہری نظر تھی اور انھوں نے ان دونوں کو موضوع بحث بنایا۔ بہت سی کتابوں پر ان کے تبصرے بھی چھپے۔ زیات کے مقالات سے ان کی جودت طبع، اپج، بالغ نظری اور ادبی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے ابن سینا (۹۸۰-۱۰۳۷ء) عبدالعزیز فہمی (۱۸۷۰-۱۹۵۱ء) قاسم امین (۱۸۶۳-۱۹۰۸ء) احمد امین، محمد اقبال، علی احمد لطفی السید، احمد ذکی پاشا (۱۸۶۷-۱۹۳۴ء) محمد عبدہ، حافظ ابراہیم، سعد زغلول پاشا، احمد شوقی، ابو الطیب المتنبی، مصطفیٰ لطفی المنفلوطی، محمد فرید وجدی (۱۸۸۹-۱۹۶۴ء) العقاد، مصطفیٰ عبدالرزاق بک، مصطفیٰ صادق الرافعی[2]، جمال الدین افغانی، علی محمود طٰہٰ، احمد عرابی (۱۸۴۱-۱۹۱۱ء) توفیق الحکیم، النقراشی ([illegible])

---

[1] انور الجندی۔ المعارک الادبیۃ۔ مطبعۃ الرسالہ (بدون تاریخ) ص ۱۶۶

[2] احمد حسن الزیات: وحی الرسالہ ۴/ ۳۶۳-۳۶۵ [3] ایضاً الطبعۃ الخامسۃ۔ مطبعۃ الرسالہ۔ ۱۹۵۶ء ص الٹائیٹل۔

عبدالقادر مازنی، مصطفیٰ کامل اور ابو العلا المعری[۲] (۹۷۳ء-۱۰۵۷ء) وغیرہ کے نظریات وخیالات پر جو بحث کی ہے اس سے خود ان کے ادبی خیالات اور نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، اس لیے ذیل میں مذکورۂ بالا ادبا و شعرا اور ناقدین و مصلحین میں سے بعض کے متعلق ان کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں

علی محمود طہ | وہ بیسویں صدی کے شاعر علی محمود طہ (۱۹۰۲ء-۱۹۴۹ء) کے متعلق کہتے ہیں میں علی سے ستائیس برس سے واقف ہوں جب میں نے انہیں منصورہ کی شاداب سرزمین پر دیکھا تھا، اس وقت وہ نوجوان ہونہار، بلند حوصلہ تھے، انکے خیالات سحر انگیز تھے، صرف جمال پسندی، تغزل اور لطف ولذت کے دلدادہ تھے اور زندگی کو آسمانی غزل کا حصہ سمجھتے تھے۔ جس کے گیت زمانہ گاتا ہے اور جس پر فلک وجد کرتا ہے[۳]۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی محمود فطرت کے حسن وجمال کا شیدائی اور اس کی رعنائی سے لطف اندوز ہونے کے لیے بیتاب ہے، وہ فطری شاعر تھا جس کی شاعری حقیقت سے قریب اور عشق و محبت کے جذبات سے مملو ہے، زیات نے اپنے مقالہ میں علی محمود طہ کی شاعری کے علاوہ اس کی سیرت وشخصیت کے خط وخال بھی نمایاں کیے ہیں۔ ایک دوسرے مقالہ "علی محمود طہ بین اللحد والمھد" میں وہ کہتے ہیں کہ

علی محمود طہ کا پورا دن ساحل سمندر پر واقع ہوٹل میں گزرتا۔ دن بھر وہ کبھی لکھتا اور کبھی پڑھتا۔ یہی اس کا مشغلہ تھا اور جب کبھی اس سے فراغت ملی تو

---

[۱] احمد حسن الزیات: الطبعۃ الثانیہ۔ مکتبہ نہضہ مصر ۱۹۵۶ ص ۳۸۳-۳۸۴ [۲]

[۲] ایضاً الطبعۃ الرابعۃ۔ مطبعۃ الرسالہ۔ مصر ۱۹۵۰ء ۲/ ۶ [۳] ایضاً ۳/ ۱۷۵۔

وہ افق بعید پر غائرانہ نظر ڈالتا اور اس سے فرصت پانے کے بعد ایک شاعر کے مانند وہ غور وفکر میں محو ہو جاتا[۱]۔

ان دونوں مقالوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تنقیدی شعور کے حامل تھے اور ان کی تنقید میں استدلال کا رنگ ہوتا تھا۔ انھوں نے علی محمود طہ کے متعلق جو باتیں کہیں ہیں وہ حقیقت سے بہت قریب ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ الزیات نے بڑی دقت نظر اور باریک بینی سے علی محمود طہ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

حافظ ابراہیم | الزیات نے حافظ ابراہیم کی زندگی اور شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی تعمیری مقصد نہیں تھا۔ اس نے تمام چیزوں کا صرف ظاہری مشاہدہ کیا۔ ان کی گہرائی معلوم کرنے اور انکی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ حکمت و فلسفہ سے ناواقف ہے۔ اس کا مطالعہ اور دائرۂ تحقیق محدود ہے۔ اس کی زندگی مادیت سے عبارت ہے۔ مصر میں اس کی امیدیں خدیو کے آستانہ سے وابستہ رہیں اور وہ ہمیشہ خدیو عباس اور سلطان عبدالحمید کی قصیدہ خوانی میں مصروف رہا وہ امام محمد عبدہ اور ان کے ہمنواؤں سے اس بنا پر جا ملا کہ یہ حضرات برسر اقتدار انگریزوں کے محبوب تھے۔ اس دوران ملکہ وکٹوریہ کی شان میں قصیدہ کہا اور بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کی بھی تعریف سے باز نہ آیا۔ اس کے بعد عوام کے دکھ درد میں شامل ہوا۔ مصطفیٰ کامل کے ساتھ رہا اور اپنے قصائد کے حوالے سے عوام کے اندر جذبہ وطنیت قومیت کو بیدار کیا حشمت پاشا کے حضور بھی مدحیہ قصیدہ پیش کیا۔ مختصر یہ ہے کہ حافظ ابراہیم کی

---

[۱] وحی الرسالہ ۳/ ۲۰۸

توجہ کا مرکز وہ مقامات بنے جہاں سے اسے مادی منفعت کی امید وابستہ تھی۔ آخری ایام میں "وفد" پارٹی[۱] سے وابستہ ہوگیا[۲]۔

حافظ ابراہیم کی ذہنیت اور شاعری کے بارے میں یہ اظہار خیال بجا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر کوئی شاعر درباروں اور آستانوں کا ہو کر رہ جائے تو اس کی شاعری میں تعمق، دقیق النظری اور گہرائی نہیں آسکتی۔ بلکہ اس کی نظریں صرف درباروں اور سلاطین کی جاہ و حشمت تک ہی محدود رہیں گی جبکہ الزیات کو اس کا اعتراف ہے کہ حافظ ابراہیم صاحب ذوق، پاک طینت اور زبردست قوت حافظہ کا مالک تھا جو اپنی صلاحیتوں کی بنا پر بادشاہوں کے دربار میں اثر و رسوخ حاصل کرکے ان کی فیاضیوں اور داد و دہش سے تمتع بھی ہوتا تھا[۳]۔

حافظ ابراہیم کی شاعری کے ضمن میں سلاطین کی مجالس کے بارے میں دلچسپ معلومات، ادیبوں کے اشعار و زبان دانی کے واقعات تحریر کیے ہیں۔

آخر میں الزیات نے لکھا ہے کہ نقائص کے باوجود حافظ کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے جدید شاعری کی ابتدا کی۔ بارودی، حافظ، شوقی، صبری (۱۸۵۴ء - ۱۹۲۳ء) اور خلیل مطران کے زمرہ میں اس کا نام بھی آتا ہے، ان شعراء نے عربی شاعری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا، حافظ ابراہیم قدیم شاعری سے استفادہ کے قائل تھے، ان میں یک گونہ انفرادیت بھی ہے، انھوں نے آلام و مصائب اور قوم کے حالات کی اچھی تصویر کشی کی ہے[۴]۔

۱؎ وحی الرسالہ ۱/۲۶۳-۲۶۴ ۲؎ ایضاً ۲/۱۶۴ - ۲۶۵ ۳؎ ایضاً ۱/۲۶۵، ۴؎ ایضاً ۱/۲۶۶۔

مصطفیٰ صادق رافعی

طٰہٰ حسین، محمود طٰہٰ اور حافظ ابراہیم سے متعلق الزیات کے خیالات کو پیش کرنے کے بعد بیسویں صدی کے تین اہم ادیب مصطفیٰ صادق الرافعی، مصطفیٰ منفلوطی اور احمد امین کے بارے میں احمد حسن الزیات کے خیالات پیش کیے جائیں گے۔ ان تینوں میں ان کو رافعی کی تحریروں سے بڑی گہری وابستگی تھی اور یہ نظریاتی لحاظ سے ان سے ہم آہنگ بھی تھے۔

وہ رافعی کے اسلوب تحریر سے بہت متاثر تھے اور اسے مثالی اسلوب قرار دیتے تھے ان کے نزدیک حسد و جہل اور ماضی سے رشتہ جوڑے رکھنے کی بنا پر رافعی پر روایت پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔

ان کے بیان کے مطابق رافعی کا اسلوب داخلی اور خارجی عیوب سے پاک ہے اس میں سلاست، ایجاز اور گہرائی کی کارفرمائی ہے جو ان کی اچھی صلاحیت، خوش ذوقی اور ذہانت و ذکاوت کا نتیجہ ہے۔ رافعی کی تحریروں سے فنی بلند پائیگی کا پتہ چلتا ہے۔ یہی قوت فن ایک صاحب فن کی سب سے بڑی معراج ہے، یہی چیز اسے اختراع اور منظر کشی کی قوت عطا کرتی ہے، وہ مفرد لفظوں کو ویسے ہی آراستہ کرتا اور سجاتا ہے جس طرح کہ ایک مصور مختلف رنگوں سے تصاویر کی نوک و پلک درست کرتا ہے[۱]۔

رافعی چیزوں پر غور کرتے ہیں اور مکمل غور و خوض کے بعد ہی وہ ان کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ وہ اپنی باتوں اور خیالات کو کم سے کم الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی ان کے یہاں تشنگی محسوس ہونے

۱؎ وحی الرسالہ ۱/۴۴۸۔

لگتی ہے۔[1] رافعی کو عربی زبان وادب پر عبور حاصل تھا وہ عربی ادب کی باریکیوں سے واقف تھے۔ خدا نے انہیں تنقیدی بصیرت عطا کی تھی۔ نحو وصرف کے قواعد، لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال اور جملوں میں ربط پیدا کرنے کے ماہر تھے۔[2]

رافعی نے عربی زبان وادب کے علاوہ کسی دوسری زبان وادب کو معیار و محور قرار نہیں دیا۔ اس سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ الزیات نے عربی ادب کو معیاری اس لئے قرار دیا کہ قرآن کریم کا نزول اس زبان میں ہوا اور ادب و بلاغت کے نقطۂ نظر سے یہ الہامی اور دنیا کی سب سے شاہکار کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عظیم کتاب کے ہوتے ہوئے قدیم و جدید کی بحث کو انھوں نے لائق اعتناء تصور نہیں کیا۔[3]

رافعی کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے تمام ادبی و معاشرتی مسائل میں قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کی ہے اور قرآن ہی ان کی نظر میں دنیا کا سب سے عظیم فلسفہ ہے۔ انہیں نظریات کی وجہ سے ان کو ہدف ملامت بننا پڑا۔ لیکن وہ ہر قسم کے طنز و تعریض کے باوجود اپنے موقف پر ثابت قدم رہ کر ملحدانہ نظریات کا جواب دیتے رہے۔

لطفی منفلوطی | لطفی منفلوطی اپنی دو کتابوں "النظرات" اور "العبرات" کی بدولت عربی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب و مصنف تھے۔ جن کو ان دونوں کتابوں نے شہرت دوام بخشی ہے، اہل ذوق ان کی لطافت و حلاوت سے برابر لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ الزیات بھی

---

[1] وحی الرسالہ ۱/۴۴۸ [2] ایضاً ۱/۴۴۸ [3] ایضاً ۱/۴۵۰۔

منفلوطی کے اسلوب نگارش سے متاثر تھے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"کان المنفلوطی قطعة موسیقیة فی ظاهره وباطنه۔ فهو موتلف الخلق، متلائم الذوق، متناسق الفکر، متسق الاسلوب، منسجم الزی۔ لا تلمح فی قوله ولا فی فعله شذوذ العبقریة ولا نشوز الفدامة۔ کان صحیح الفهم فی بطء، سلیم الفکر فی جهد، دقیق الحس فی سکون، هیوب اللسان فی تحفظ وهذه الخلال تظهر صاحبها للناس فی مظهر العی الجاهل فهو لذلک کان یتقی المجالس ویتجنب الجدل ویکره الخطابة۔"[1]

دراصل منفلوطی فطری ادیب تھے، اس میں ان کے ریاض واکتساب کا کوئی دخل نہیں تھا، ریاضت، اکتساب اور کثرت مطالعہ سے کوئی ادیب ایجاد واختراع اور انفرادی اسلوب کا مالک نہیں ہو سکتا ہے۔[2] منفلوطی کو ایجاد واختراع کی صلاحیت مبدأ فیاض کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔

قدماء میں منفلوطی، ابن مقفع اور ابن العمید سے متاثر ہوئے اور نئے ادباء میں خلیل جبران اور نعیمہ سے۔ ابن مقفع اور ابن العمید سے انداز تحریر لیا اور خلیل جبران و نعیمہ سے موضوعات کی جدت اور افکار کا تنوع اخذ کیا۔[3] لیکن انھوں نے دوسروں سے ماخوذ چیزوں کو بھی اپنے مخصوص رنگ میں کر لیا ہے۔ ان کی تحریروں میں بڑی جاذبیت اور دلکشی ہوتی ہے۔

احمد امین | منفلوطی اور رافعی کے بعد آیئے دیکھیں کہ بیسویں صدی کے عقلیت پسند

---

[1] وحی الرسالہ ۱/۳۹۲ [2] ایضاً ۱/۳۹۴ [3] ایضاً ۱/۳۹۵۔

ادیب احمد امین کے متعلق الزیات کا کیا خیال ہے۔ احمد امین کو دینی علوم اور عربی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ انہیں ازہر کے ان نابغۂ روزگار علماء و ادباء میں شمار کیا جاتا ہے جنھیں دقیق النظر اور وسیع النظر تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ دینی حیثیت سے مجتہد اور لسانی نقطۂ نظر سے صاحب الرائے مانے گئے ہیں۔[۱]

احمد امین نے اسلوب سے زیادہ مفہوم و معنی پر زور دیا ہے۔ افکار و خیالات کو ان کے یہاں اولیت حاصل تھی اور زبان کو محض ترسیل و ابلاغ کا ایک آلہ تصور کرتے تھے۔[۲] انھوں نے اپنی تحریروں میں قرآن و حدیث سے بھی استدلال کیا۔ عربی شاعری اور نثر پر ان کی مضبوط گرفت تھی۔ انہیں علم بیان و تقدیر پر بھی عبور حاصل تھا۔ افکار و خیالات سے قطع نظر انھوں نے اپنی تحریروں میں حسن و دلآویزی بھی پیدا کی۔ الفاظ و معنی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا انہیں اچھا سلیقہ تھا۔ جیسا کہ ان کی مشہور سرگزشت حیات "حیاتی" سے ظاہر ہے۔[۳]

وہ ایک مستند و معتبر ادیب کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عربوں اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو عقلیت پسندی کا درس دیا۔ ان کی شہرۂ آفاق کتابوں "فجر الاسلام"، "ظہر الاسلام" اور "ضحی الاسلام" میں یہی علمی، عقلی اور معروضی انداز پایا جاتا ہے۔ ان کتابوں کی تصنیف و تالیف میں انکی محنت شاقہ اور انکا خون جگر شامل ہے۔ ان سے ضلالت و گمراہی سے مامون رکھنے والی عقل اور حق کیطرف رہنمائی کرنے والی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور مختلف مذاہب و مکاتب فکر سے واقفیت ہوتی ہے۔[۴] احمد امین کی علمی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ورق گردانی میں صرف کر دی۔ مطالعہ کی کثرت سے انکی بصارت جاتی رہی۔ وہ ایک کسان کے بیٹے تھے لیکن اپنی محنت، لگن اور جوش و جذبۂ عمل سے آفاقی شخصیت کے مالک ہو گئے۔

[illegible]

ادب و معاشرہ زیات کے یہاں ادب معاشرہ پر اثر انداز ہو کر اس کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیتا ہے وہ اپنے مقالہ "الامتیازات والادب" میں لکھتے ہیں ادب روح کی تعبیر، افکار کی وضاحت اور جذبات کی عکاسی کا نام ہے۔ زندگی کے ارتقائی مراحل اور نت نئی تبدیلیوں کے اثرات ضرور قبول کرتا ہے۔ یہ دراصل ان جنتوں کی تلاش کا نام ہے جن میں تعمیری پہلو پنہاں ہو۔ ادب کبھی انسانی جذبات میں اشتعال اور تلاطم پیدا کرتا ہے اور کبھی انہیں سرد اور منجمد کر دیتا ہے۔ مسکراہٹیں اور تلخیاں دونوں عطا کرتا ہے۔ ادب کی نشو و نما میں معاشرہ کا بڑا حصہ ہوتا ہے، معاشرہ کے ضعف و انحلال، فساد و انتشار یا قوت و استحکام اور صحت و درستگی کے اثرات ادب پر بھی مترتب ہوتے ہیں جس زمانے میں عربوں کی شجاعت کا چرچا ساری دنیا میں تھا اور وہ مجد و شرف سے ہمکنار تھے اس وقت ان کا ادب صداقت کا آئینہ دار تھا۔

قدیم زمانے کا عربی ادب حقائق اور سچائیوں کا ترجمان ہوتا تھا۔ لیکن موجودہ عربی ادب کا رشتہ اصل عربی ادب سے منقطع ہو گیا ہے اور اس نے یورپین ادب کے کلچر کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے اس لیے اس سے ہمارے اصلی احساسات و جذبات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی اور یہ ہمارے مسائل و افکار اور مصائب و مشکلات کو پیش کرنے سے قاصر ہے کیونکہ دونوں کی قدروں میں مشرق و مغرب کی دوری ہے۔[۱]

الزیات نے یورپین ادب کی اندھی تقلید کی ہمیشہ مخالفت کی، کیونکہ وہ عرب معاشرے پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ جدید مصری ادب کے باب میں کہتے ہیں کہ

---

[۱] وحی الرسالہ ۱/۱۲۲-۱۲۵۔

اس کی مثال اس جدید مصری معاشرہ کے مانند ہے جو اپنے وجود کو کھو بیٹھا اور اپنے امتیازات کو دریا برد کر چکا ہو، دوسری زبان کی اس طور سے پابندی کرنے کا بھی یہی انجام ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ غیر ملکی زبان کے عقائد بھی اس پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔

الزیات کا کہنا ہے کہ مصری معاشرے پر یورپین ادب کا انطباق جہالت کے مترادف ہے کیونکہ عرب اور یورپ کے مزاج میں تضاد ہے۔ مصری شعراء کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ صحراء کے بارے میں غور کریں نخلستان کی منظر کشی کریں۔ نہ کہ وہ انگریزی مزاج کی ترجمانی کریں۔ الزیات کے نزدیک فن کو اپنے ملک، اپنے معاشرے اور اپنی شخصیات کی ترجمانی کرنے والا ہونا چاہیے۔ اگر شعراء اپنے جذبات سے انحراف کریں تو ان کی شاعری لایعنی ہے۔ الزیات کو شکایت ہے کہ ہم اس مستعار ادب پر قانع ہو گئے ہیں جو ہمارے ذہن و دماغ پر مسلط کیا جا رہا ہے اور ہمارے کانوں میں ٹھونسا جا رہا ہے۔ اس وقت مصری ادیب تمام چیزوں میں غیر ملکیوں کی پیروی کر رہے ہیں[1]

الزیات اپنے متعدد مقالات میں یورپین ادب سے کلی اتفاق کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ عربی زبان اور اس کے آداب و اصول کی حمایت میں ہمیشہ رطب اللسان رہے۔ ادب کا مفہوم اور عربی و انگریزی ادب کا بنیادی فرق واضح کرتے ہوئے عربی ادیبوں اور شاعروں کے اس رویہ کا ذکر کرتے ہیں جو انگریزی اور مصری ادب کے سلسلے میں ان کا ہونا چاہیے۔ الزیات نے

[1] وحی الرسالہ ۱/۱۲۷۔

ادب سے متعلق اپنے ایک مقالہ میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ادب کا انقلاب سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اور اسے کامیاب بنانے میں اہل علم و ادب کا غیر معمولی حصہ ہوتا ہے۔

انقلاب کی راہ سیاست داں ہموار کرتے ہیں لیکن بعد میں اہل علم و ادب اس کو لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بنا دیتے ہیں۔ وہ ان کے دلوں کو انقلابی نعروں سے بھر دیتے ہیں۔ الزیات کہتے ہیں کہ قائدین اپنی سیاسی بصیرت، حسن تدبر اور لائحہ عمل سے دنیا کو متحیر کر دیتے ہیں اور ادباء اور شعراء بیان کی صداقت، زبان کی بلاغت اور استدلال کی قوت سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ کر دیتے ہیں جبکہ نہ انہیں سیاسی تعلیم دی گئی ہے نہ انھوں نے قانون کا مطالعہ کیا ہے اور نہ ہی ان کو ادب کی تعلیم کے مواقع میسر آئے ہیں۔ لیکن جب انسان کے اندر جرأت و شجاعت کا عنصر پیدا ہوتا ہے تو یہ چیز اس کے اندر بلندی، خود اعتمادی اور روحانی طاقت کو مضبوط اور مستحکم کر دیتی ہے۔ آدمی کی فطرت پر جس چیز کا غلبہ ہوتا ہے اسی مناسبت سے اسے لقب بھی دیا جاتا ہے مثلاً انسان کو لیڈر، سیاست داں، مصلح، مصنف یا شاعر اس کے اندر کارفرما قوت ہی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ حضرت خالدؓ، حضرت معاویہؓ، نیپولین، سحبان، جاحظ، متنبی اور ہوجر وغیرہ کا شمار عبقریوں میں ہوتا ہے لیکن انکی قوتوں اور صلاحیتوں کے مد نظر انہیں مختلف القاب سے نوازا گیا[1]

احمد حسن الزیات کہتے ہیں کہ ادب اور انقلاب لازم و ملزوم ہیں۔ ادب

[1] وحی الرسالہ ۱/۲۵۴۔

فکری رہنمائی کا نام ہے اور انقلاب عملی کارکردگی کا۔ ادب ایک نظریہ ہے اور انقلاب ایک عزیمت کا نام ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ ادب کا اثر اہل انقلاب پر نہیں ہوتا وہ حق کے منکر اور حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ آلام و مصائب میں جب سارے لوگ خاموش ہو جاتے ہیں تو ادب ہی اس وقت لوگوں میں بیداری پیدا کرتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ ملک کی قیادت و سیادت ظالم سلاطین کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے جب گمراہ سیاست داں قوم کو ذلیل و خوار کر دیتے اور اس کے اندر انتشار برپا کر دیتے ہیں اور ترقی کی راہیں مسدود کر کے اسے بے حیائیوں کے اس موڑ پر کھڑا کر دیتے ہیں جہاں سے واپسی اور نجات کی کوئی سبیل نہیں ہوتی تو ان حالات میں ادب بھی جمود و تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن قوم کے اندر جب بیداری آئی اور اسکے قائدین جاگ اٹھے تو خاموشی ٹوٹی۔ ادیب پر لازم ہے کہ وہ انقلاب سے قبل اور انقلاب کے بعد بھی قوم کو زندہ رکھنے کی کوشش کرے اور قوم کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اہل قلم کے لیے ایسے مواقع فراہم کرے جن میں وہ آزادی کے ساتھ ملک و قوم کے حالات پر اظہار خیال کر سکیں اور اہل قلم کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قوم کے ضمیر کو مردہ نہ ہونے دیں۔ اگر یہ دونوں گروہ اس طرح دوش بدوش جدوجہد کریں تو ایک تعمیری انقلاب برپا ہوگا[1] ہر زمانے میں ایسی مثالیں موجود رہی ہیں کہ اہل قلم نے عوام کے تعاون سے تاریخ اور زمانے کا رخ موڑ دیا ہے۔

(باقی)

[1] وحی الرسالہ / ۱

احوال قادر ولی عرف شاہ میراں کا تحقیقی جائزہ

از جناب شاکرہ صاحبہ وجیانگر کالونی حیدرآباد

فروری ۱۹۹۱ء کے معارف میں اردو کی ایک قدیم مثنوی "احوال قادر ولی عرف شاہ میراں کا تحقیقی جائزہ" کے عنوان سے جناب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی صاحب کا تحقیقی مضمون دلچسپی سے پڑھا۔ ندوی صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے جنوبی ہند کے دور دراز گوشہ کی ایک بزرگ ہستی کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں کتاب کے مصنف اور اس کے ممدوح کے بارے میں کچھ مزید معلومات ڈاکٹر صاحب اور قارئین معارف کی اطلاع کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

جیسا کہ مثنوی کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی نگار کا نام اعز الدین اور تخلص نامی تھا۔ ان کے بارے میں حسب ذیل کتب و رسائل میں بھی مواد موجود ہے۔

۱۔ نصیر الدین ہاشمی: مدراس میں اردو۔ حیدرآباد ۱۹۳۸ء

۲۔ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال: مدراس میں اردو ادب کی نشوونما جلد اول ۱۹۷۹ء حیدرآباد۔

in carnaTac. Madras-1974.

۴۔ رسالہ نوائے ادب: اپریل ۱۹۵۵ء مضمون سخاوت مرزا۔

اس کے علاوہ ان قدیم کتابوں میں بھی نامی کا تذکرہ موجود ہے۔

تذکرہ گلزار اعظم
تذکرہ صبح وطن
سخنوران بلند فکر

} اول الذکر دونوں کتابیں نواب غلام غوث خاں کی تالیف ہیں اور تینوں مدراس سے طبع ہو چکی ہیں۔

مندرجہ بالا کتابوں میں اعز الدین خاں نامی کے جو حالات درج ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اعز الدین خاں کی پیدائش ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۷ء میں ہوئی ان کا تاریخی نام غلام علی ہے۔ ان کے والد نواب حامد علی خاں مدراس کے والاجاہی خاندان کے مرزبوم گوپامئو کے رہنے والے تھے۔ ان کی نواب انورالدین خاں سے قرابت تھی۔

اعز الدین خاں کی شادی بھی والاجاہی خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ وہ جنوبی ہند کے مشہور شاعر باقر آگاہ کے شاگرد تھے۔ نامی اور مستقیم تخلص تھا انھوں نے اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں مشق سخن کی ہے یہ نواب عمدۃ الامرا کے درباری شاعر تھے اور انہیں ملک الشعرا اور مستقیم جنگ کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔

نامی کے شعری سرمایہ میں دیوان کے علاوہ نوبہار عشق، بہارستان عشق، سلیمان نامہ، گنج قدرت، قصہ بی بی مریم اور داغستان کلفت وغیرہ شامل ہیں۔

مثنوی گنج قدرت ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں نامی نے لکھی تھی اس میں جنوبی ہند کی

ایک بزرگ شخصیت شیخ شاہ الحمید میراں عبدالقادر المتوفی ۹۷۸ھ کے حالات نظم کیے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں مدراس کے مطبع عزیزیہ سے شایع ہو چکی ہے۔

نامی کا انتقال ۱۸ رجمادی الاول ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء کو مدراس میں ہوا۔ ساحل سمندر کے قریب اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔ جہاں اب پریسیڈنسی کالج ہے (غالباً مزار محصور ہے)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے جس بے نام مثنوی کا تجزیہ کیا اور نمونہ دیا ہے وہ نامی کی گنج قدرت ہی ہے۔

متعلقہ مقامات میں کچی یا کوچی کا موجودہ نام کوچین ہی ہے۔ البتہ متتم ہو سکتا ہے کہ متم ہی کا بدلا ہوا نام ہو جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے۔

قادر ولی کے بارے میں بھی مندرجہ بالا کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ الحمید ۹۱۰ھ/۱۵۰۲ء میں مانک پور میں پیدا ہوئے اور کم عمری ہی میں دینی خدمت کے لیے وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے گوالیار آئے وہاں سید محمد غوث گوالیاری م ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر حج و زیارت اور کئی ملکوں کی سیاحت کرتے ہوئے موجودہ ٹامل ناڈو سابقہ مدراس صوبہ کے شہر ناگور میں مقیم ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ ان کی درگاہ اب بھی زیارت گاہ عام ہے اور عرس بہت دھوم دھام سے ہوتا ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں بڑی عقیدت سے شریک ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ درگاہ ناگور کے بارے میں کچھ اور معلومات مندرجہ ماخذ

میں شامل ہیں The Dargah of Nagore and The culture
of The Tamil Muslims by M. Abdur Raheem _ Addi
tional Professer of Bulletin of The Institute
of Traditional culture Madras. University
of Madras 600005. India. Jan. To June. 1973

اس کا بھی خلاصہ پیش ہے

توزک والاجاہی مرتبہ برہان خاں ہانڈی کے مطابق جو ابتدائی انیسویں صدی عیسوی میں لکھا گیا ہے۔ قادر ولی سید محمد غوث گوالیاری کی ہدایت پر پہلے ترچناپلی نطھر نگر (موجودہ ترچراپلی) میں نطھر ولی سے ملاقات کرکے ناگور پہنچے جس کا نام بعد میں انہیں کے نام پر قادر نگر رکھا گیا (یہ نام اب رائج نہیں ہے) قادر ولی کے حالات و کرامات میں عربی فارسی، اردو اور ٹامل میں کئی کتابیں ملتی ہیں۔ سب سے مشہور اور مقبول غلام قادر ناولار کی گنج الکرامات یا گنج الکرامات ہے جو ٹامل زبان میں ۱۸۸۹ء میں لکھی گئی۔ ممکن ہے کہ اسی کا کوئی دکھنی یا ٹامل نسخہ کنز الکرامات کے نام سے نامی کو دستیاب ہوا ہو۔ کیونکہ ٹامل میں ز کے بجائے ج ہی کا لفظ مستعمل ہے

پورے ساحل کارومنڈل پر جگہ جگہ مسلم اولیا یا شہیدوں کے مزارات ملتے ہیں جو اسلام کے ابتدائی دور میں آنے والے ان مسلمانوں کے ہو سکتے ہیں جو حملہ علائی سے بہت پہلے وسط ایشیا کے ملکوں سے جنوبی ہند کے ساحلوں پر پہونچے اور وہیں فوت ہوئے یا پھر پرتگیزیوں سے مقابلہ میں

شہید ہوئے ہوں۔ ان کے بارے میں تاریخی شہادت بہت کم ملتی ہے۔ معاصر تاریخیں اور سفرنامے جو اب دستیاب ہیں وہ اس بارے میں خاموش ہیں (معاصر عربی تاریخوں میں شاید ہی ان کا ذکر ہوا ہو) بہرحال گنج الکرامات اور عوامی روایات کے مطابق قادر ولی تنجور کے اچیوت اپا نایک کے زمانے میں ناگور آئے۔ آپ کی دعا سے راجا کو ایک مزمن مرض سے شفا حاصل ہوئی اور ایک لڑکا بھی اس کی رانی کے یہاں پیدا ہوا۔ اس واقعہ کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اچیوت اپا نایک بیحد روادار راجہ تھا۔ جو مسلمانوں کو دوست رکھتا تھا البتہ پرتگیزیوں کے تبلیغی طریقوں اور مقامی لوگوں سے ان کے برتاؤ پر ناخوش رہتا تھا اور آگے چل کر دونوں میں لڑائی بھی ہوئی۔ راجا کی بیماری کا بھی مقامی ادب میں اشارہ ملتا ہے اور آگے کے دور میں یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ تنجاور کے مرہٹہ راجا قادر ولی کے عقیدت مند تھے، پرتاپ سنگھ (۱۷۳۹ء - ۱۷۶۳ء) نے درگاہ کے اخراجات کے لیے پندرہ گاؤں دیے تھے اور اسی نے درگاہ اور اس کے ساتھ مسجد تعمیر کرائی تھی درگاہ کا مینار بھی اسی راجہ کا تعمیر کیا ہوا ہے۔

سرسوتی محل تنجور کے موڈی اور ٹامل اسناد سے ان راجاؤں کی درگاہ سے عقیدت اور فیاضانہ عطایا کا پتہ چلتا ہے۔

اس علاقہ میں ہندو مسلم یکجہتی کو قادر ولی کے روحانی اثرات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

بڑا اچھا ہوگا اگر ڈاکٹر حامد اللہ ندوی صاحب اس موضوع پر مزید تحقیق و تفحص کریں۔

سرسید اکادمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سیمنار

"علی گڑھ تحریک پس منظر اور پیش منظر"

از ضیاء الدین اصلاحی

۲۹ اپریل تا یکم مئی ۱۹۹۱ء کو سرسید اکادمی علی گڑھ کی جانب سے مسلم یونیورسٹی میں اس کا تیسرا سہ روزہ سیمنار "علی گڑھ تحریک پس منظر اور پیش منظر" کے عنوان سے ہوا، جس میں اتر پردیش، دہلی، بہار اور کیرالا کی یونیورسٹیوں کے فضلا شریک ہوئے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد جب مسلمان بے شمار مشکلات و مصائب میں گھر گئے تو انہیں تباہی و بربادی سے بچانے کیلئے "علی گڑھ تحریک" وجود میں آئی۔ اس کا مقصد انکی "نشاۃ ثانیہ" اور ہر شعبۂ زندگی میں اصلاح و انقلاب برپا کرنا تھا چنانچہ مسلمانوں کی مذہبی سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر اس کے دور رس اثرات مترتب ہوئے اور تحریک سے علم و ادب کا فروغ اور اردو زبان کی مفید خدمت بھی انجام پائی، سیمنار میں ان تمام پہلوؤں پر مضامین پڑھے گئے، افتتاحی جلسہ کی صدارت پروفیسر محمد نسیم فاروقی وائس چانسلر نے کی، پروفیسر انوار الحق حقی نے کلیدی خطبہ دیا جو سیر حاصل تھا، سرسید اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں تحریک کے خط و خال نمایاں کیے اور سرسید اکادمی اور سیمنار کے اغراض و مقاصد بتائے۔

مقالات کے پانچ جلسے ہوئے، پہلا جلسہ علی گڑھ تحریک کے سیاسی پہلو پر پروفیسر ابو الفضل عثمانی کی صدارت میں ہوا، دوسرا علی گڑھ تحریک اور اردو زبان و ادب کے موضوع پر پروفیسر منظر عباس صدر شعبۂ اردو کی صدارت میں ہوا، علی گڑھ تحریک اور مذہبی فکر پر ہونے والے جلسہ کی صدارت راقم نے کی، علی گڑھ تحریک اور سماجی و تہذیبی اصلاح کا جلسہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (دہلی) کی اور

علی گڑھ تحریک اور تعلیم کا پروفیسر عشرت فاروقی کی صدارت میں ہوا

راقم نے "علی گڑھ تحریک اور اس سے وابستہ ایک محب اردو۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق" پر اپنا مضمون پڑھا تو کچھ لوگوں کو حیرت ہوئی اور بعض نے طنز بھی کیا، راقم نے عرض کیا کہ میں نے مولوی صاحب کی اردو خدمات اور تحقیقی کاوشوں کا ذکر کیا ہے اس میں مولانا شبلیؒ، مولانا ابو الکلام اور مولانا عبد السلام ندویؒ پر ان کے بیجا اعتراض اور نکتہ چینی سے تعرض کا موقع نہیں تھا۔ اس جلسہ کے صدر پروفیسر منظر عباس نے مولانا شبلیؒ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے سرسید کے رفقا میں ان کو سب سے قد آور عالم، ادیب اور انشا پرداز بتایا۔

مجھے علی گڑھ تحریک اور مذہبی فکر کے موضوع پر ہونے والے جلسہ کی صدارت دے کر عجیب مشکل میں ڈال دیا گیا تھا کیونکہ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے، سرسید کے انتقال کے بعد مولانا شبلیؒ جب لوگوں کے اصرار سے ان پر لکھنے کے لیے مجبور ہوئے تو سرسید احمد خاں اور اردو لٹریچر کے موضوع پر لکھا تاکہ ان کے مذہبی افکار و خیالات زیر بحث نہ آئیں، میں نے ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس بارے میں لوگوں کو ان سے اختلاف کا حق تو ہے لیکن ان کی تحقیر و استخفاف اور ان پر کوئی فتویٰ عائد کرنے کا حق نہیں میں نے خطبات احمدیہ، سرسید کے عشق رسول، اخلاص اور نیک جذبہ کا ذکر کرکے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اسی کو دیکھے گا اور اس کی وجہ سے ان کی خطاؤں کو بھی معاف کردے گا۔

سیمنار میں پڑھے جانے والے مقالات پر اچھی بحث و گفتگو ہوئی اور وہ اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر عتیق احمد صدیقی اور ان کے رفقائے کار کی سعی و جانفشانی سے کامیاب رہا، البتہ جلسوں میں حاضرین کی کم تعداد دیکھکر حیرت ہوئی۔

اخبار علمیہ

روس میں سنہ ۱۹۳۰ء میں اسٹالن کے حکم سے جب عربی حروف کا استعمال ممنوع ہوا تو حکومت نے عربی رسم الخط کی جگہ روسی رسم الخط کو رائج کر دیا، اس کے بعد وہاں قرآن مجید کی تعلیم و تدریس بھی موقوف ہو گئی، مگر اب روسی مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ عربی حروف و رسم الخط کو دوبارہ سرکاری حیثیت دی جائے، چنانچہ تاجکستان کی ریاست نے پیش قدمی کرتے ہوئے ایک نئے قانون کے تحت روسی حروف کو موقوف کر دیا، وہاں کی نیشنل اکادمی روسی رسم الخط میں شایع شدہ بارہ ہزار اہم کتابوں کو عربی رسم الخط میں منتقل کر رہی ہے، داغستان، ازبکستان، ترکمنیہ اور آذربیجان میں بھی عربی رسم الخط سے تعلق و شیفتگی بڑھ رہی ہے۔ روسی ٹیلی ویژن پر پہلی بار امام بخاریؒ کی حیات مبارکہ پر ایک مذہبی سیریل بھی پیش کیا گیا جسے مصری ٹی وی کے تعاون سے تیار کیا گیا تھا، اس میں ان تمام مقامات کی تصویر کشی کی گئی جہاں امام بخاریؒ نے اپنی زندگی گذاری تھی، سیریل کی زبان عربی ہے مگر اس کے ساتھ روسی ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

چین کے مسلمانوں کے حالات بھی روسی مسلمانوں سے مختلف نہیں، ان کی تعداد تقریباً ۵۰ ملین ہے تاہم اخبار و رسائل میں ان کے متعلق معلومات کم شایع ہوتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے وہ خود نام و نمود کے بغیر خاموشی اور یکسوئی سے اپنی زندگی کی تعمیر نو میں مصروف ہیں، روسی مسلمانوں کی طرح وہ بھی کمیونسٹ نظام

کے اندر اک آگ کے دریا سے گذر رہے ہیں لیکن موجودہ حالات کے نتیجہ میں بندشیں کچھ نرم ہوئیں اور مذہب، زبان اور ثقافت کے تحفظ کے لیے بعض مراعات بھی حاصل ہوئیں، پاکستان کے انگریزی ماہنامہ الفاروق انٹرنیشنل کے ایک پُر از معلومات مضمون سے معلوم ہوا کہ پورے چین میں ۲۵۰۰۰ سے زیادہ مساجد ہیں جن میں پندرہ ہزار صرف زن جیانگ XINJIANG میں ہیں، چند مسجدیں ساتویں آٹھویں صدی کی ہیں، قدیم ترین مسجد چین کے قدیم دارالسلطنت زیان میں ہے، وہاں کے ایک غیر مسلم حکمران نے آٹھویں صدی میں ایک مسجد تعمیر کی تھی جس کا شمار دنیا کی چند سب سے بڑی مسجدوں میں کیا جا سکتا ہے، چینی زبان کے علاوہ زن جیانگ کی مقامی زبان UIGHUR میں بھی قرآن مجید کے تراجم موجود ہیں، اس زبان کا رسم الخط سندھی زبان کے مشابہ ہے، مسلمانوں کے لیے حلال ذبیحہ کے لیے جدا مذابح بھی ہیں، اہم ریستورانوں، جہاز اور ریل وغیرہ میں بھی انکے لیے حلال ذبیحہ مہیا کیا جاتا ہے۔

لندن یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ ہند کے استاد پروفیسر اے ایل باشم کا ایک مجموعۂ مقالات 'دی اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف کلاسکل ہندوازم' کے نام سے ان کے انتقال کے بعد حال ہی میں شایع ہوا ہے یہ ہندو مذہب کی تاریخ اور فلسفہ کو جاننے کے لیے بڑا معاون ہے۔ عقیدۂ تناسخ ان مقالات کا بنیادی و مرکزی نقطہ ہے، انکے خیال میں اسے قبائلی سماج کی بدامنی، عدم تحفظ اور مایوسی کی وجہ سے فروغ ہوا۔ انکی تحقیق کے مطابق رام جی کی پوجا حضرت عیسیٰؑ کے بعد شروع ہوئی، ہنومان کے تصور کی مقبولیت رزم نامۂ رام کے ساتھ ہوئی،

صرف گونڈ قبائل کی داستانوں میں چار بھائیوں کی کہانی میں ایک بندر کا ذکر ملتا ہے جس نے ایک پر شور دریا عبور کرانے میں ان بھائیوں کی مدد کی تھی وہ کہتے ہیں کہ بھگوت گیتا کی مذہبیت ایک نئے ہندو مت کی نقیب ہے جو پرانوں کی پوجا سے جدا ہے۔

برہمن، ہندوستان کی کل آبادی میں ۳٫۵ % سے زیادہ نہیں ہیں لیکن علم، سائنس، انتظامیہ اور حکومت میں وہ ہمیشہ اعلیٰ مقام پر فائز رہے مہاراشٹر کے مسٹر اسٹیٹی نے سرکاری ملازمتوں میں ان کے اور دوسروں کے اعداد و شمار کا یہ جائزہ پیش کیا ہے، برطانوی عہد میں حکومت کے عہدوں پر سب سے زیادہ کائستھ فائز تھے، اس وقت ان کا تناسب تقریباً ۴۰ فیصد تھا، اب وہ صرف ۷ فیصد رہ گئے ہیں، دور غلامی میں مسلمانوں کا تناسب ۳۵ فیصد تھا اور اب ۳٫۵ فیصد ہو گیا ہے، عیسائی، انگریزوں کے سایہ میں ۱۵ فیصد ملازمتوں میں تھے، اب وہ صرف ایک فیصد ہیں، اچھوت اور بیک ورڈ اس وقت صفر تھے اور اب ۹ فیصد ہیں، آزادی سے پہلے برہمنوں کی نمائندگی ۳ فیصد تھی، لیکن اب وہ ۷۰ فیصد جگہوں پر چھائے ہوئے ہیں، ....

اعلیٰ درجہ کی ملازمتوں میں ۵۰۰ میں ۳۱۰ برہمن ہیں، ۲۶ اسٹیٹ چیف سکریٹریوں میں ۱۹، ۲۷ گورنروں اور لفٹیننٹ گورنروں میں ۱۳، سپریم کورٹ کے ۱۶ ججوں میں ۹، ہائی کورٹ کے ۳۳۰ ججوں میں

۱۶۶، ۱۴۰ سفیروں میں ۵۸، ۹۸ وائس چانسلروں میں ۵۰، ۴۳۸ ضلع مجسٹریٹوں میں ۲۵۰ اور ۳۳۰۰ آئی اے ایس افسروں میں ۲۳۷۶ برہمن ہیں، لوک سبھا کے ۵۳۰ ممبروں میں سے ۱۹۰ اور راجیہ سبھا کے ۲۴۴ میں ۸۹ ممبر برہمن ہیں ع ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا۔

ملک کی کثیر آبادی کے اس استحصال پر لوگ چپ سادھے ہوئے تھے مگر اب اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگی ہیں، بنگلور کے روزنامہ دکن ہیرالڈ میں پی ایس سریدھر مورتی کے ایک مراسلہ میں نہایت تلخی سے ریڈیوں کاشتکاروں، جاٹوں اور وکالیگاؤں کو دھرم میں شودر قرار دیے جانے کا ذکر ہے، حجام، ملاح، دھوبی اور بنکر وغیرہ بھی شودر میں اور یہ کل آبادی کا چالیس فیصد ہیں، ڈاکٹر کے، وی پٹ ایا نے ورن کے مطابق جب خود کو شودر پایا تو اعلان کر دیا کہ وہ ہندو ہی نہیں ہیں، آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی اور برہمو سماج کے راجہ رام موہن رائے نے صاف صاف کہا کہ ہندو مندر، ذات پات کی تفریق و امتیاز کا سب سے بڑا مرکز تھے اور ویدوں اور اپنشدوں میں مورتی پوجا کی کوئی بنیاد نہیں، ڈی کے پارٹی کے بانی ای، وی راما سوامی نے تمام مندروں کے انہدام کی آواز بلند کی ہے، تعلیم یافتہ دلتوں کی بھی یہی رائے ہے کیونکہ انکے آبا و اجداد کو انکی وجہ سے ذلت و رسوائی برداشت کرنی پڑتی تھی، مراسلہ نگار کے نزدیک اجودھیا کے مندر کا افسانہ سراسر بے بنیاد ہے جس کی تعمیر کا مطالبہ صرف ۱۵ فیصد لوگ کر رہے ہیں ہندوؤں کی اکثریت کو اس سے سروکار نہیں

ع۔ص

مکتوب پاکستان

لاہور ۲۵ اپریل ۱۹۹۱ء

محب فاضل و مکرم جناب اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ معارف کا تازہ شمارہ (اپریل ۱۹۹۱ء) کل ملا، اگرچہ مارچ کے شمارے کا ہنوز انتظار ہے۔ شاید یہ شمارہ لاہور میں کسی کو نہیں ملا[1]۔

آپ نے اخبار علمیہ کے تحت یورپ اور امریکہ میں اسلامی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کی کثرتِ تعداد پر اپنے استعجاب اور حیرت کا اظہار کیا ہے، لیکن اس میں حیرت اور تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ان ممالک کے سیاست کاروں اور دانشوروں کی انگلیاں ہمیشہ عالم اسلام کی نبض پر رہتی ہیں۔

یورپی اور امریکی یونیورسٹیاں اور دوسرے علمی ادارے اپنے ہاں کے طلبہ کو گرانقدر وظائف دے کر اسلامی ممالک میں مطالعہ اور علمی تحقیق کے لیے بھیجتے رہتے ہیں اور یہ طلبہ کئی کئی ماہ ان ممالک میں قیام کرکے دوست و دشمن اور موافق و مخالف شخصیات سے مل کر مفید مطلب معلومات حاصل کرکے اپنی حکومتوں کو پہونچاتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں کے اہل علم اسلامی ممالک میں آثار قدیمہ دیکھنے جاتے ہیں اور کسی علمی یا سیاسی شخصیت سے ملنا گوارا نہیں کرتے، پچھلے برس ایک امریکن اسکالر ہمارے اردو دائرہ

[1] معارف پابندی سے روانہ کیا جاتا ہے، لیکن محکمۂ ڈاک کی "کرم فرمائیوں" سے وہ اکثر قدر دانوں کو نہیں ملتا۔

معارف اسلامیہ کا طریق کار دیکھنے لاہور آیا تھا اور وہ روانی سے اردو بولتا تھا۔

شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی کی نئی کتابیں، جو مراکش سے لے کر کویت تک کے عرب ممالک میں شایع ہوتی ہیں، ان کی دوماہی فہرست مطبوعات امریکن لائبریری آف کانگرس کا ایک ذیلی دفتر واقعہ قاہرہ شایع کرتا ہے۔ ان کے علاوہ فرانس اور جرمنی میں عربی زبان و ادب، اسلامی تاریخ و ثقافت اور مسلم ممالک کے تازہ حالات پر اس کثرت سے کتابیں شایع ہوتی ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے، گذشتہ برس اقبال کے جاوید نامہ کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا تھا۔ اب ایک مصری عالم نے اس فرانسیسی ترجمہ کو عربی میں منتقل کردیا ہے۔

قومیت عربی کی تحریک اور اس کے فروغ پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا قلق اور اضطراب بالکل بجا اور صحیح ہے۔ موصوف کئی برسوں سے عالم عرب کو اس تحریک کی فتنہ انگیزی کی طرف متوجہ کررہے ہیں۔ اس تحریک کے ایک عراقی نمائندے یعنی صدام حسین نے عالم عرب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی ضد، ہٹ دھرمی، خود پسندی اور خود رائی نے امتِ عربیہ کو روسیاہ کردیا ہے۔

عرب قومیت کے فتنے کا توڑ اخوان المسلمون کی تحریک کرسکتی تھی، مگر افسوس ہے کہ یہ مفید تحریک بعض پرجوش اخوانی رہنماؤں کی جلد بازی اور انتہا پسندی اور مصری حکومت کے تشدد اور منتقم مزاجی سے جلد ہی دم توڑ گئی اور تحریک کے کارکنوں کو ناقابل بیان مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

مولانا سید منت اللہ رحمانی مرحوم پر مولوی عمیر الصدیق صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے مگر وہ ایک بات لکھنی بھول گئے، یعنی مرحوم کانگرس کی کسی تحریک

میں گرفتار ہو کر قید و بند سے بھی دوچار ہوئے تھے

آپ معارف کے شذرات کو کتابی صورت میں شایع کر رہے ہیں، لیکن اس سے زیادہ اہم کام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مکاتیب کی جمع و ترتیب کا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ مکاتیب وقت گزرنے کے ساتھ کہیں تلف اور ضایع نہ ہو جائیں [1]

میں نے ترجمان القرآن، لاہور (فروری ۱۹۹۱ء) میں مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی اور ان کی علمی خدمات پر ایک مضمون لکھا تھا۔ گمان غالب ہے کہ یہ مضمون آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ شاید یہ مضمون تذکرۃ المحدثین جلد چہارم میں کارآمد ہو سکے [2]

تذکرۃ المحدثین جلد سوم کا ابھی تک انتظار ہے۔ پچھلے خط میں آپ نے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوگا۔

رفقائے کرام کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

فقط والسلام
نیازمند
(شیخ) نذیر حسین

---

[1] حضرت سید صاحبؒ کے نام بعض مشاہیر کے خطوط کا ایک مجموعہ جلد ہی شایع ہونے والا ہے، اس کے دیباچہ میں ہم نے درخواست کی ہے کہ جن کے پاس حضرت سید صاحبؒ کے خطوط ہوں وہ ہم کو بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اب یہی درخواست معارف کے ذریعہ کر رہے ہیں۔

[2] ضرور، مگر یہ شمارہ یہاں تک نہیں پہنچا۔ انشاءاللہ کہیں سے حاصل کر دوں گا۔

وفیات

آہ! مولانا عبدالملک جامعی مدنی

از مولانا افتخار فریدی، مرادآباد۔

یہ خبر انتہائی رنج اور صدمہ کے ساتھ سنی گئی کہ مہاجر مدینہ مولانا عبدالملک جامعی مدینہ منورہ میں انتقال فرما گئے۔ ان کی ذات گرامی گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابقین اولین میں تھے اور اس کے کئی شعبے ان کی صلاحیتوں سے پروان چڑھے۔ مولانا، مولانا محمد علی جوہر کے فدائی اور خادم اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے محبوب شاگردوں میں سے تھے۔ حق بات کہنے میں کبھی ان کو تامل نہیں ہوتا تھا۔ اپنے استاد ذاکر صاحب سے بھی اس وقت کے امر کی ایک بات کہی تھی جس سے ذاکر صاحب رات بھر روتے رہے۔

مولانا عبدالملک کا بچپن اپنے والد منشی عبدالقیوم صاحب کے ساتھ جو مشہور خطاط تھے بجنور میں گزرا جہاں سے مشہور زمانہ اخبار "مدینہ" نکلتا تھا۔ یہاں وہ کئی عبقری صحافیوں اور ہمدردان ملت کی خاص شفقتوں کے مورد رہے [1]۔ وہیں سے مولانا نے تحریک خلافت

---

[1] یہیں کے قیام میں انھوں نے مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ سے عربی کے چند سبق پڑھے، جس کا اعتراف انھوں نے اپنے بعض خطوط میں مجھ سے ممنونیت کے ساتھ کیا، مولانا اصلاحی ابتدا میں مدینہ کے اڈیٹر تھے (معارف)

میں بھی حصہ لیا، مولانا کے والد محترم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کلکتہ میں رہ کر "ترجمان القرآن" کی کتابت بہت ہی بے کسی کے عالم میں کی اور اسے مدینہ پریس بجنور میں طبع کرایا۔ دوسرا ایڈیشن لاہور میں طبع کرایا اور دونوں کا منافع مولانا آزاد کو پہنچایا۔

مولانا عبدالملک صاحب مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے فدائی اور عاشق تھے اور ساری ایمان افروز تربیت انہیں سے حاصل کی تھی۔ فرمایا کرتے تھے مولانا محمد علی بیسویں صدی کے مردِ مومن ہیں۔ ان کا تعلق مولانا کے خاندان کے ہر ہر فرد سے تھا۔ کراچی میں بھی ان کے نواسوں سے بڑی محبت کیا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم نے تقریباً ۵۰ سال مدینہ منورہ میں قیام فرمایا اور حفظ قرآن کا نظام چلاتے رہے۔ مولانا کی زندگی بہت ہی بے کسی اور غربت میں گزری اور کبھی کوئی دنیاوی منفعت حاصل نہیں کی حتیٰ کہ مدینہ کے پچاس سالہ قیام کے دوران وہاں کی شہریت حاصل کرنے کیلئے کبھی کسی سے سفارش نہیں کی جبکہ چاہتے تو یہ کام انتہائی آسانی سے ہو جاتا۔ دعوت و تبلیغ کے اہم ترین کام کا درد ہمیشہ ان پر غالب رہا اور سخت سے سخت حالات اور صحت کی خرابی کے باوجود اسکی فکر فرماتے رہے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل مرحوم نے راقم کو جو خط تحریر فرمایا تھا اس میں اسکی بشارت دی تھی کہ روس چین اور ہندوستان کے ایک علاقے کو ہدایت ملے گی۔

مولانا مرحوم نے مدینہ اور اس کے اطراف میں حفظ قرآن کو فروغ دیا اور تحفیظ القرآن کے نام سے ایک ادارہ کی منظوری سعودی حکومت سے ایک ایسے وقت میں کرائی جبکہ حفظ قرآن کا نظام وہاں بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ اب الحمد للہ اس ادارہ کی برکت سے مدینہ منورہ میں ایک لاکھ سے زیادہ قرآن مجید کے حفاظ موجود ہیں۔

خدا مولانا مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مرتبہ سے سرفراز فرمائے۔ آمین

مطبوعات جدیدہ

کاروانِ زندگی (حصہ چہارم) از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۴۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپے، ناشر مکتبہ اسلام ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی آپ بیتی لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، یہ اس کی چوتھی جلد ہے جو تین برسوں ۸۸ء سے ۹۰ء تک کے واقعات و حوادث پر مشتمل ہے اس میں ملک و بیرون ملک کی مختلف دینی و اصلاحی سرگرمیوں، اداروں اور تحریکوں، علمی سفر اور کانفرنسوں اور جلسوں کی روداد قلمبند کی گئی ہے، مولانا کے دردمند دل کو جس واقعہ نے بہت زیادہ تڑپایا اور بے چین کیا ہے وہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا مسئلہ ہے، اس کی وجہ سے انسانیت کا زیاں ہوا ہے، ملک تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچ گیا ہے اور امن و امان مفقود ہو گیا ہے، مولانا کے سحر طراز قلم نے اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والی وحشت و درندگی، نفرت و تشدد اور فرقہ وارانہ ماحول کی پوری تصویر کھینچ دی ہے اور بتایا ہے کہ معاملہ کو اتنا پیچیدہ اور اس حد تک بگاڑ دینے میں ہندو مسلم فرقوں کے لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی اور اہل سیاست کی کرتب بازی کو خاص دخل ہے، بابری مسجد کی اس انداز سے تحریک چلانے والے مسلم لیڈروں نے ہندوؤں میں مذہبی جوش پیدا کر دیا اور اپنی جذباتیت اور کوتاہ نظری سے غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کی راہ روک دی، مولانا نے بابری مسجد کے حل کے لیے اپنی اور اپنے بعض رفقا کی کوششوں اور مدراس کے شنکراچاریہ سے ملاقات کا

ذکر کیا ہے اور اس کے تعلق سے اپنے اوپر ہونے والی نکتہ چینی کا جواب دیا ہے، دوسرا
واقعہ جس پر مولانا کو سب سے زیادہ قلبی اذیت ہے وہ عالم عربی کا تازہ المیہ ہے جس کے
خطرات کو ان سے زیادہ محسوس کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے، روس کے موجودہ انقلاب
۱۹۸۹ء میں ہندوستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلی پھر وی۔ پی سنگھ کی وزارت عظمیٰ سے سبکدوشی
اور چندر شیکھر کے اس عہدہ پر فائز ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ان برسوں میں وفات پانے والے جن
اہل تعلق کے حالات و کمالات بیان کرکے اپنے غیر معمولی رنج و ملال کا ذکر کیا ہے انکے نام یہ ہیں۔
پاکستانی صدر محمد ضیاء الحق، شیخ محمد صالح قزاز، مولانا عبید اللہ بلیاوی، ڈاکٹر محمد آصف قدوائی،
شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری، پروفیسر مشیر الحق، میر واعظ مولوی محمد فاروق، مولانا ابو اللیث
اصلاحی ندوی نیز اپنی اہلیہ اور عزیز بھائی سید احمد حسنی مرحوم فاضل مصنف بین الاقوامی شخصیت
کے مالک اور عالمگیر شہرت کے حامل ہیں، ہندوستان اور عالم اسلام ہی نہیں یورپ، افریقہ اور
امریکہ کی مختلف انجمنوں اور اداروں سے ان کا تعلق ہے۔ اس کتاب میں مختلف جگہوں کے سفر،
جلسوں اور سیمناروں میں شرکت اور خطاب فرمانے کا ذکر ہے، ان تقریروں اور اپنی دوسری
تحریروں کے جابجا اقتباسات بھی دیے ہیں، اپنی مشہور کتاب المرتضیٰ کی تالیف کے اسباب اور
اسکی رسم اجراء کی تقریب کی روداد تحریر کی ہے، اصلاح و ارشاد اور دعوت و تبلیغ مولانا کا خاص
ذوق ہے جو کتاب میں ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ، اسلام اور مسلمانوں کی
سربلندی اور سرمایہ ملت کی نگہبانی کے علاوہ انسانیت کی فلاح و ترقی، ملک و قوم کی تعمیر و
تشکیل اور ہندوستان کی عظمت و سرخروئی کے لیے مولانا کے جوش و خروش اور دلچسپی و سرگرمی
کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے واقعات و حالات کو بے کم و کاست بیان کرکے اپنی آپ بیتی
کو مستند تاریخی دستاویز بنا دیا ہے یہ انکے قلم کی شگفتگی و دل آویزی کا بھی عمدہ نمونہ ہے،
اس میں اسماء و اعلام کا اشاریہ اور مکمل فہرست بھی دی گئی ہے۔ "ض"

نوائے مشرق از جناب سعید احمد، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت طباعت
عمدہ، صفحات ۲۴۹، قیمت ۳۰ روپیہ، پتہ: تاج کمپنی ۳۱۵۱ ترکمان گیٹ دہلی

جناب سعید احمد لکچرر محمد حسن انٹر کالج جونپور، علامہ اقبال اور مولانا
سید ابوالاعلیٰ مودودی، دونوں کے شیدائی اور عقیدتمند ہیں، ان کی نظر
میں ان دونوں مشاہیر کے فکر و نظر اور دل و دماغ میں یکسانیت ہے، بطور
ثبوت انھوں نے کلیات اقبال کے ۱۱۵ اشعار کا انتخاب کیا اور ہر شعر کی ترجمانی
مولانا مودودی کی تحریروں میں تلاش کرلی، ان کی یہ کوشش ندرت و افادیت
سے خالی نہیں، البتہ ان کا یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ "اقبال پر ناقدین نے بہت کچھ لکھا
ہے مگر کسی نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا" ان کی یہ رائے بھی مبہم ہے کہ "اقبال
کا پیغام انقلاب کے پردوں میں چھپا رہ گیا بلکہ چھپا دیا گیا"، ان کے خیال میں
ان کی دونوں ممدوح ہستیوں میں وہی فرق ہے جو لاکھ حکیم سر بجیب اور
ایک کلیم سربکف میں ہوتا ہے، خدا معلوم مدح و تحسین کی یہ کون سی قسم ہے تنقیحات
کو ہر جگہ تنقیہات لکھا گیا ہے۔ جو کتابت کی غلطی ہوگی۔

نمود صبح از جناب تہور علی زیدی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت
بہتر نیز، طباعت دیدہ زیب، صفحات ۲۷۲، قیمت پچاس روپے، پتہ:
درج نہیں۔

جناب تہور علی زیدی پاکستان کے خوش فکر و خوش گو شاعر ہیں،
انھوں نے پاکستان بننے سے پہلے علی گڑھ و بلند شہر میں مسلم لیگ کی تحریک
میں جوش و سرگرمی سے حصہ لیا، تقسیم کے بعد وہ حیدرآباد سندھ میں مقیم

ہوئے، اور سیاست کو خیرباد کہہ کر پیشہ طب کو خدمت خلق کا ذریعہ بنایا، شاعری انھوں نے اپنے عہد اور گردوپیش کے حالات و واقعات اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کی، زیرنظر مجموعہ ان کے پاکیزہ خیالات کا خوبصورت مرقع ہے، اس کی ابتدا حمد و نعت اور منقبت سے کی گئی ہے اور آخر میں غزلیں دی گئی ہیں، نعتیہ اشعار میں ان کی طبیعت کی سرشاری اور جذبات کی وارفتگی نے بڑی تاثیر پیدا کر دی ہے غزلوں میں بھی نعتیہ شعر آگئے ہیں، شروع میں ان کی صاحبزادی مہ جبیں زیدی کے قلم سے ان کا تعارف درج ہے، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی اور احمد ہمدانی کی مختصر تحریریں بھی مجموعہ میں شامل ہیں، باطنی محاسن کی طرح کتاب ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے، سرورق پر نمود صبح کی نہایت خوبصورت عکاسی ہے

شیشے کے گھر از جناب محمد عبدالحکیم شرف قادری، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۸ پتہ: مرکزی مجلس رضا، پوسٹ بکس نمبر ۲۲۰۶ لاہور پاکستان۔

بعض اہل حدیث علماء نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور ان کے مکتب فکر کے لوگوں پر انگریزی حکومت سے سازباز کا الزام لگایا تھا، اس کتاب میں کہا گیا ہے کہ ع این گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند۔

رفیق منزل مولانا افضل حسین مرحوم نمبر، مدیر منور حسین فلاحی، صفحات ۱۴۴، کتابت و طباعت بہتر، قیمت دس روپیے، پتہ: رفیق منزل، ۲۳۰، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جماعت اسلامی کے قدیم و مخلص رکن مولانا افضل حسین مرحوم پہلے درسگاہ

اسلامی رامپور کے ناظم اور آخر میں جماعت اسلامی کے قیم ہوئے وہ جماعت کے علاوہ دوسرے ملی کاموں میں بھی پیش پیش رہے، اور وہ حلقہ جماعت کے باہر کے لوگوں میں بھی مقبول تھے، دینی تعلیم و تربیت ان کا خاص موضوع تھا، بچوں کے ذہن، مزاج اور طبیعت کے مطابق اسلامی رنگ میں انھوں نے جو نصاب تیار کیا اسے اور ان کی کتاب 'فن تعلیم و تربیت' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، جس کے متعدد ایڈیشن شایع ہوئے، ماہنامہ رفیق منزل نے مولانا کی وفات کے بعد ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر نکالا ہے جس میں مولانا ابواللیث اصلاحی مرحوم، مولانا وحیدالدین خاں اور مختلف اصحاب قلم نے مولانا کی سیرت و شخصیت کے جلوؤں کو نمایاں کیا ہے، مولانا مرحوم کی ڈائری کے چند صفحات اور ان کا ایک اہم مضمون 'اقلیتی ممالک میں بچوں کی دینی تعلیم و تربیت' اور ان کے ایک خط کا عکس بھی اس نمبر میں شامل ہے۔

شعاع سالانہ میگزین انجمن اسلام گرلز پرائمری اسکول ماہم، مدیرہ، مس رحمانی محمود صفحات ۱۱۶، کتابت و طباعت، دیدہ زیب، قیمت درج نہیں، پتہ: انجمن اسلام گرلز پرائمری اسکول ماہم بمبئی ۴۰۰۰۱۶۔

انجمن اسلام گرلز پرائمری اسکول، بمبئی کا ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے پہلے اس کے سالانہ میگزین کونپل کے نام سے نکلتے تھے، نیا میگزین شعاع کے نام سے شایع ہوا ہے جو مفید دینی و اخلاقی مضامین پر مشتمل ہے، اس کے لیے اسکول کی طالبات و استانیاں تحسین و حوصلہ افزائی کی مستحق ہیں۔

ناشنیدہ مرتبہ ڈاکٹر طفیل احمد مدنی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۶۴ مجلد مع گرد پوش قیمت ۴۰ روپیے پتہ: عبداللہ سہیل ۱۸۹ منہاج پور، الہ آباد ۳

ڈاکٹر طفیل احمد مدنی ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں جو شعرا کی گروہ بندی اور ستائش و صلہ سے بے پروا ہو کر اپنے حال میں مست و سرشار رہتے ہیں، انکی شاعری اسی مستی و سرشاری کا نتیجہ ہے، ان کا میلان غزل کی طرف ہے، عشق و محبت کے پاکیزہ جذبات کی ترجمانی میں بھی انکے یہاں عہد و ماحول کی تصویر ملتی ہے، انھوں نے غزل کی لطافت و دلکشی بھی باقی رکھی ہے، اردو فارسی اور عربی زبانوں پر اچھی نظر ہونے کی وجہ سے ان کا کلام اغلاط سے محفوظ ہے وہ معرفت و حقیقت کے لذت شناس ہیں اس لیے ناشنیدہ حقایق بھی انکے لیے شنیدہ کے مانند ہیں، یہ مجموعہ ادبی حلقوں کی پذیرائی کے لائق ہے۔ (ع۔ ص)

ضروری اطلاع

کاغذ اور طباعت کی دوسری اشیا کی بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر معارف کے زر تعاون میں اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے، توقع ہے کہ یہ اضافہ اس کے قدردانوں کو گراں نہیں گذرے گا جون ۱۹۹۱ء سے زر تعاون درج ذیل شرح کے مطابق روانہ فرمائیں۔

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے۔ فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک سے پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک سے پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس۔ ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ کراچی

ڈرافٹ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے نام سے بنوا کر بھیجیں۔

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔

۲۔ سیرۃ النبیؐ جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔

۳۔ سیرۃ النبیؐ جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔

۴۔ سیرۃ النبیؐ جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔

۵۔ سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔

۶۔ رحمت عالمؐ۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ

۷۔ خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔

۸۔ سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔

۹۔ حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔

۱۰۔ ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔

۱۱۔ ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔

۱۲۔ خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔

۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔

۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی)

۱۵۔ نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی)

۱۶۔ یاد رفتگان۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات

۱۷۔ مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔

۱۸۔ مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔

۱۹۔ مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں)

۲۰۔ برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔

۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے

"منیجر"